وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ



ندائے کوہسار

خصوصی شمارہ: سیرت نمبر

سہ ماہی مجلہ (برقی اشاعت)

جلد نمبر:	شمارہ نمبر:	مناسبت:
۱	۳	ماہ ربیع الاول

ماہ: اگست، ستمبر، اکتوبر

زیر نگرانی:

ابن القیم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ

nidaekohsaar@gmail.com

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

سہ ماہی برقی مجلہ

ندائے کوہسار

☆☆☆

خصوصی شمارہ: سیرت نمبر

☆ ربیع الاول۔ربیع الآخر۔جمادی الاولیٰ ۱۴۴۸ھ ☆ اگست،ستمبر۔اکتوبر ۲۰۲۶ء ☆ جلد نمبر: (۱) ☆ شمارہ نمبر: (۳)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

نوٹ:

مضمون نگار کی رائے سے ادارے والوں کا اتفاق ضروری نہیں ہے!

ابن القیم ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر ٹرسٹ، جھارکھنڈ، انڈیا

رابطہ نمبر: مدیر مجلہ: (9973816437) نائب مشرف: (7488704349) معاون خاص: (9693037322)

درسِ قرآن

ندائے وحی

محمد مبارک سلفی حفظہ اللہ

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی روشنی میں:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

ترجمہ: "اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عظیم اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔" (سورۃ القلم: ۴)

☆ آیت کا تعارف:

یہ آیتِ کریمہ سورۃ القلم کی چوتھی آیت ہے۔ اس مختصر مگر جامع آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایسے وصف کو بیان فرمایا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری سیرت کا جامع عنوان قرار دیا جا سکتا ہے، اور وہ ہے عظیم اخلاق۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب معاشرہ مختلف اخلاقی خرابیوں، باہمی دشمنیوں، ظلم و جاہلیت اور قبائلی تعصّبات میں مبتلا تھا۔ ایسے ماحول میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت، تعلیم اور عملی زندگی کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل فرمائی جس کی بنیاد ایمان، عدل، رحمت، عفو، امانت، صدق اور حسنِ اخلاق پر قائم تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے محض نسب، اقتدار یا ظاہری وجاہت کا ذکر نہیں کیا، بلکہ فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورۃ القلم: ۴)

☆ لغوی توضیح:

"خُلُق" کے معنی عادت، طبیعت، سیرت، کردار اور باطنی اوصاف کے ہیں۔ انسان کے وہ اوصاف جو اس کی گفتگو، معاملات اور طرزِ عمل میں ظاہر ہوں، انہیں اخلاق کہا جاتا ہے۔

"عظیم" کے معنی بڑا، بلند، اعلیٰ اور نہایت باوقار کے ہیں۔

گویا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ ایسے بلند اور عظیم اخلاق کے حامل ہیں جو عام انسانی اخلاق سے کہیں بلند تر ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت مختلف اقوال نقل کیے ہیں؛ حضرت ابن عباس اور مجاہد رحمہما اللہ سے "خلق عظیم" کی تفسیر عظیم دین سے منقول ہے، حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اور ممنوعات سے اجتناب سے تعبیر کیا، جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول مشہور تعبیر ہے: "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" (ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔)

☆ "خُلُقٌ عَظِيمٌ" سے کیا مراد ہے؟

مفسرین نے اس کے مختلف پہلو بیان کیے ہیں، تاہم ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کی ہدایات کا عملی نمونہ تھی۔

قرآن نے جہاں عفو کا حکم دیا، آپ ﷺ نے معاف کر کے دکھایا۔

قرآن نے رحمت کی تعلیم دی، آپ ﷺ سراپا رحمت بن کر آئے۔

قرآن نے عدل کا حکم دیا، آپ ﷺ نے دوست و دشمن سب کے ساتھ عدل فرمایا۔

قرآن نے صبر کی تعلیم دی، آپ ﷺ نے مصائب و تکالیف میں صبر کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی۔

قرآن نے امانت وصداقت کی تعلیم دی، آپ ﷺ بعثت سے پہلے ہی الصادق، الامین کے لقب سے معروف تھے۔

اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھے جانے پر قرآن ہی کی طرف رہنمائی فرمائی۔ صحیح مسلم میں ان کا جواب منقول ہے کہ آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔

☆ قرآن اور سیرتِ رسول ﷺ کا تعلق:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سیرتِ رسول ﷺ اس کلام کی عملی تفسیر ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ صبر کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے صبر کر کے دکھایا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ عفو کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے معاف کر کے دکھایا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ تواضع کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کا نمونہ پیش کیا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ رحم وشفقت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے انسانوں ہی نہیں بلکہ بچوں، عورتوں، کمزوروں اور جانوروں تک کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمایا۔

اسی لیے سیرت کا مطالعہ دراصل قرآن کو زندگی کے عملی نمونے میں دیکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

☆ سیرتِ رسول ﷺ کی سب سے جامع قرآنی تعبیر:

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (سورۃ الأحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔"

یہ آیت سیرتِ نبوی ﷺ کے مقصد کو واضح کرتی ہے۔

سیرت صرف اس لیے نہیں پڑھی جاتی کہ ہمیں معلوم ہو کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کب ہوئی، ہجرت کب ہوئی، کون سی غزوات پیش آئیں اور کون سے واقعات کس ترتیب سے رونما ہوئے۔

بلکہ سیرت کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو اپنا نمونہ بنائیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ اور اخلاقِ کریمہ:

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا ایک جامع نمونہ تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ فحش گو تھے اور نہ فحش کلامی اختیار فرماتے تھے، اور آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: "إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا"۔
ترجمہ: "تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔" (بخاری: ۳۵۵۹)
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فضیلت صرف ظاہری عبادات تک محدود نہیں بلکہ حسنِ اخلاق بھی ایمان و فضیلت کا اہم مظہر ہے۔

☆ رحمت اور شفقت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ الأنبیاء: ۱۰۷)
ترجمہ: "اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔"
آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو رحمت کا یہ وصف زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں نظر آتا ہے۔
آپ ﷺ بچوں سے محبت فرماتے، کمزوروں کا خیال رکھتے، غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دیتے، یتیموں کی کفالت کی ترغیب دیتے اور لوگوں کی تکالیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔
یہی وہ اخلاق ہے جس نے سخت دل انسانوں کو بھی آپ ﷺ کے قریب کر دیا۔

☆ عفو و درگزر:

قرآن نے آپ ﷺ کو فرمایا: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (سورۃ الأعراف: ۱۹۹)
ترجمہ: "درگزر کو اختیار کیجیے، نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے۔"
آپ ﷺ نے اس قرآنی تعلیم کو اپنی زندگی میں عملاً نافذ فرمایا۔
فتح مکہ کے موقع پر وہ لوگ آپ ﷺ کے سامنے تھے جنہوں نے برسوں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو ستایا، گھروں سے نکالا، جنگیں لڑیں اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ لیکن جب وہ آپ ﷺ کے سامنے بے بس کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے انتقام کے بجائے عفو و درگزر کا معاملہ فرمایا۔ "یہی ہے خلقِ عظیم۔"

☆ طائف کا واقعہ اور اخلاقِ نبوی ﷺ:

طائف میں رسول اللہ ﷺ کو شدید اذیت پہنچائی گئی۔ آپ ﷺ کو پتھر مارے گئے، جسم مبارک لہولہان ہو گیا اور آپ ﷺ کو وہاں سے نکلنا پڑا۔
یہ ایسا موقع تھا جہاں انسان اپنے دشمن کے لیے بددعا کر سکتا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان سے خیر اور رحمت کے جذبات ظاہر ہوئے۔
آپ ﷺ کی نگاہ صرف موجودہ نسل پر نہیں تھی؛ آپ ﷺ آنے والی نسلوں کی ہدایت کے بھی امیدوار تھے۔
یہی وہ مقام ہے جہاں سیرت ہمیں سمجھاتی ہے کہ عظمت طاقت رکھنے میں نہیں، طاقت کے باوجود اخلاق کا دامن نہ چھوڑنے

میں ہے۔

☆ **رسول اللہ ﷺ کا اخلاق اور گھر:**

حسنِ اخلاق کا اصل امتحان گھر میں ہوتا ہے۔

باہر انسان مسکرا سکتا ہے، لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آ سکتا ہے؛ لیکن گھر کے اندر انسان کا اصل مزاج ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے گھر والوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کا بہترین نمونہ پیش فرمایا۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي۔" (سنن ترمذی: ٣٨٩٥)

''تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔''

اس لیے سیرتِ نبوی ﷺ سے محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہمارے گھر والے ہمارے اخلاق سے اس محبت کو محسوس کریں۔

☆ **سیرت کا مقصد صرف واقعات یاد کرنا نہیں:**

ہم سیرت پڑھتے ہیں، سنتے ہیں، جلسوں میں بیان کرتے ہیں اور نعتیں پڑھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ سیرت ہماری زندگی میں کہاں ہے؟

اگر ہم سیرت پڑھ کر بھی جھوٹ بولتے رہیں تو ہمیں رک کر سوچنا چاہیے۔

اگر ہم سیرت پڑھ کر بھی والدین کے ساتھ بدسلوکی کریں تو ہمیں اپنے مطالعۂ سیرت کا جائزہ لینا چاہیے۔

اگر ہم سیرت پڑھ کر بھی اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کریں، پڑوسیوں کو تکلیف دیں اور معمولی اختلاف پر دشمن بن جائیں تو ہمیں اس آیت: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورہ قلم: ۴) کے سامنے اپنے کردار کو رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

☆ **مرکزی نکتہ:**

رسول اللہ ﷺ کی سیرت دراصل قرآن کے اخلاقی نظام کی عملی تصویر ہے۔

قرآن نے جس کردار کی تعلیم دی، رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا۔

اسی لیے سیرت کا حقیقی فائدہ اس وقت حاصل ہوگا جب ہم واقعات سننے سے آگے بڑھ کر نبوی اخلاق کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔

☆ **اہم نکات وفوائد:**

1۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کے اخلاق کی عظمت کی گواہی خود دی: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورۃ القلم: ۴)

2۔ رسول اللہ ﷺ کا اخلاق قرآن کی عملی تفسیر تھا؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول "کان خلقه القرآن" اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

3۔ عظیم اخلاق صرف نرم گفتگو کا نام نہیں بلکہ دین، عبادت، معاملات، صبر، عفو، عدل، رحمت اور حسنِ معاشرت سب اس میں شامل ہیں۔

4۔قرآن اور سیرت کو الگ الگ سمجھنا درست نہیں؛ قرآن اصول دیتا ہے اور سیرت ان اصولوں کی عملی صورت دکھاتی ہے۔

5۔سیرتِ رسول ﷺ کا مقصد محض تاریخی معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کو اسوۂ حسنہ بنانا ہے۔

6۔حسنِ اخلاق انسان کی دینی شخصیت کا بنیادی حصہ ہے۔

7۔حقیقی اخلاق کا امتحان مخالفین، ماتحتوں، کمزوروں اور گھر والوں کے ساتھ معاملے میں ہوتا ہے۔

8۔انسان کو اپنے مطالعۂ سیرت کے ساتھ اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیے کہ نبوی اخلاق کا ہماری زندگی میں کتنا اثر پیدا ہوا۔

آج کے لیے عملی پیغام:

آج اگر ہم واقعی رسول اللہ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں تو اپنی زندگی میں کم از کم ایک نبوی اخلاق کو مضبوط کرنے کا عہد کریں:

زبان میں سچائی، معاملات میں امانت، گھر میں نرمی، اختلاف میں انصاف، غلطی پر معافی، مصیبت میں صبر، اور نعمت میں شکر۔

یہی سیرت کا وہ پیغام ہے جو کتاب سے نکل کر کردار میں اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت، آپ ﷺ کی کامل اتباع اور آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

☆"كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ"☆

"آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔"

یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نہایت جامع جواب ہے۔ یعنی قرآن نے جن اوصاف کا حکم دیا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی زندگی میں عملاً اختیار فرمایا۔ امام ابن کثیرؒ نے اسے نقل کرتے ہوئے واضح کیا کہ آپ ﷺ قرآن کے اوامر کی پیروی اور نواہی سے اجتناب فرماتے تھے۔

ماخذ: ابن کثیر، البداية والنهاية، باب ذکر أخلاقه وشمائله؛ اصل روایت صحیح مسلم، حدیث: ۷۴۶

سیرتِ نبوی ﷺ محبت سے معرفت اور معرفت سے اتباع تک

اداریہ — مدیر مجلہ

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں پڑھا جائے تو علم میں اضافہ ہوتا ہے، اور کچھ ایسی کہ جنہیں پڑھا جائے تو انسان بدلنے بلکہ اسی انداز میں ڈھلنے لگتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اسی دوسری قسم کی حقیقت ہے۔ یہ صرف ایک عظیم انسان کی زندگی کا تذکرہ نہیں نہ ایک عظیم رہبر کی یادگار ہے، بلکہ انسان کو بہتر انسان بنانے کا مکمل دستور ہے۔ اسی لیے ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی سیرتِ نبوی ﷺ کا ذکر محض ایک مذہبی روایت نہیں رہتا؛ یہ ہمیں اپنے کردار، اپنے معاشرے اور اپنی ذمہ داریوں پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اسی احساس کے ساتھ سہ ماہی مجلہ **"ندائے کوہسار"** کا یہ خصوصی شمارہ "سیرت نمبر" پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اسے چند عنوانات میں محدود کرنا ممکن نہیں۔ قرآنِ مجید نے آپ ﷺ کی زندگی کو ہمارے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا، اس لیے سیرت کا مطالعہ دراصل دین کو ایک زندہ نمونے کی صورت میں سمجھنے کا مطالعہ ہے۔ عبادت ہو یا معاملات، گھر ہو یا معاشرہ، دعوت ہو یا قیادت، جنگ ہو یا صلح، دوست ہوں یا مخالفین، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہر میدان میں ہمارے لیے رہنمائی رکھتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (سورۃ الأحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔"

آج جب دنیا علمی ترقی کے باوجود سماجی انتشار، اخلاقی کمزوری، عدمِ برداشت، باہمی بداعتمادی اور انسانی حقوق کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے، سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ پہلے سے زیادہ معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے اس خصوصی شمارے میں سیرت کو صرف روایتی انداز میں بیان کرنے کے بجائے اس کے علمی، فکری اور عملی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس شمارے میں "سیرت النبی ﷺ قرآن کی عملی تفسیر" کے عنوان سے اس پہلو پر توجہ دی گئی ہے کہ قرآن کے اخلاقی اور عملی اصول رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کس طرح مجسم ہوئے۔ "دعوت و تبلیغ کے حکیمانہ اصول" ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ دعوت صرف بات کہنے کا نام نہیں، بلکہ مخاطب کی نفسیات، موقع و محل اور حکمت کو سمجھنے کا فن بھی ہے۔

اسی طرح "مشاورت اور شوریٰ" کا موضوع آج کے اجتماعی اور ادارہ جاتی نظام کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ "میثاقِ مدینہ" کو سماجی معاہدے کے تناظر میں دیکھنے سے ریاست، معاشرہ، مذہبی تنوع اور شہری ذمہ داریوں کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ "اقلیتوں کے حقوق اور عصرِ حاضر کے سماجی مسائل" جیسے موضوعات بھی اسی بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ سیرت ماضی کا محفوظ باب نہیں بلکہ حال سے مسلسل گفتگو کرنے والی زندہ روایت ہے۔

"خطبۂ حجۃ الوداع اور جدید انسانی حقوق" کے موضوع میں بھی یہی کوشش ہے کہ نبوی تعلیمات کو محض تاریخی حوالوں کے طور پر

نہیں بلکہ انسانی وقار، جان و مال کی حرمت، مساوات اور معاشرتی ذمہ داری کے وسیع تناظر میں سمجھا جائے۔

وطن سے محبت، اجتماعی ذمہ داری اور قومی زندگی کے تقاضے بھی ہمارے موجودہ حالات میں اہم موضوعات ہیں۔ اسی لیے "حبِ وطن کی اہمیت اور یومِ آزادی: ماضی کی قربانیاں، حال کی ذمہ داریاں اور مستقبل کے تقاضے" جیسے موضوعات کو بھی اس خصوصی شمارے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات عرض کرنا ضروری ہے: سیرت کا مقصد صرف یہ جان لینا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا؛ اصل مقصد یہ سمجھنا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا اور ہمیں اس سے کیا سیکھنا ہے؟ یہی سوال سیرت کو تاریخ سے تربیت، معلومات سے بصیرت اور عقیدت سے عمل کی طرف لے جاتا ہے۔

ربیع الاول ہمیں خوشی بھی دیتا ہے اور ذمہ داری بھی۔ محبتِ رسول ﷺ ہمارے ایمان کا حصہ ہے، لیکن اس محبت کا سب سے خوب صورت اظہار یہ ہے کہ ہماری زندگی میں آپ ﷺ کی تعلیمات کا عکس نظر آئے۔ زبان میں سچائی، معاملات میں دیانت، رویے میں نرمی، اختلاف میں شائستگی، کمزور کے لیے رحم اور حق کے معاملے میں استقامت، یہ سب سیرت کے وہ پہلو ہیں جنہیں کسی خاص دن یا مہینے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ الأنبياء: ۱۰۷)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔"

یہی رحمت شاید سیرت کا سب سے جامع عنوان ہے۔ اس میں انسان بھی ہے اور معاشرہ بھی، عبادت بھی ہے اور اخلاق بھی، عدل بھی ہے اور محبت بھی۔

"ندائے کوہسار" کا یہ خصوصی شمارہ اسی امید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ سیرتِ رسول ﷺ کے یہ مضامین ہمارے لیے محض مطالعے کا سامان نہ بنیں بلکہ غور و فکر کا دروازہ کھولیں۔ شاید کسی مضمون سے کوئی نیا سوال پیدا ہو، کسی واقعے سے کوئی سبق ملے، کسی نبوی اصول سے اپنے رویے کی اصلاح کا خیال آئے اور کسی ایک قاری کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہو کہ وہ سیرت کو صرف پڑھنے نہیں، اپنانے کی کوشش بھی کرے۔ یہی اس شمارے کی کامیابی ہوگی، اور یہی ربیع الاول کی سب سے خوب صورت یادگار بھی۔

محمد ﷺ سے وفا کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی سیرت ہمارے لفظوں میں بھی ہو، ہمارے فکر میں بھی، اور سب سے بڑھ کر ہمارے کردار میں بھی۔

اعلانِ عام

الحمدللہ! "ندائے کوہسار" ایک علمی، دینی اور اصلاحی سہ ماہی برقی مجلہ ہے، جس میں قرآن و حدیث، سیرت و اسلامی تاریخ، دینی مسائل، اصلاحِ معاشرہ اور عصرِ حاضر سے متعلق مفید و معلوماتی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

لہذا! خواہشمند اہلِ قلم سے خصوصی گزارش ہے کہ آئندہ شماروں کے لیے اپنے علمی و تحقیقی مضامین تحریر کر کے مدیرِ مجلہ سے رابطہ فرمائیں اور مقررہ وقت پر مضمون جمع کر دیں، تاکہ مجلہ بروقت شائع کیا جا سکے۔

از قلم: عبدالعزیز منصور

سیرتِ نبوی ﷺ: قرآنِ کریم کی عملی تفسیر

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور انسانیت کے لیے ہدایت کا مکمل دستور ہے، لیکن قرآن کے احکام اور تعلیمات کی عملی صورت ہمیں سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے قرآن کو صرف تلاوت نہیں فرمایا بلکہ اس کے احکام کو اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، دعوت، جہاد، صبر، عفو اور عدل کے ذریعے عملاً نافذ کر کے دکھایا۔ اسی لیے سیرتِ نبوی ﷺ کو قرآنِ کریم کی عملی تفسیر کہنا نہایت بامعنی تعبیر ہے۔

☆ قرآن کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کا اخلاق:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:
”كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ۔“ یعنی: ”آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔“ (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، حدیث: 746)
یہ مختصر مگر جامع جملہ سیرتِ نبوی ﷺ اور قرآن کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن نے جن اخلاق کی تعلیم دی، رسول اللہ ﷺ ان کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا:
﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورۃ القلم: ۴)
ترجمہ: ”اور بے شک آپ ﷺ عظیم اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔“

☆ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے مختلف پہلو بیان کیے:

قرآنِ کریم میں سیرتِ نبوی ﷺ کا مکمل تاریخی بیان نہیں ملتا، تاہم آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف ادوار، دعوتی جدوجہد، اخلاقی اوصاف، گھریلو زندگی، غزوات، منافقین کا طرزِ عمل، صحابہ سے تعلق اور مخالفین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے متعدد پہلو قرآن میں محفوظ ہیں۔

غارِ ثور کے واقعے میں آپ ﷺ کا توکل، دعوت کے دوران آپ کی بے قراری، اہلِ ایمان کے ساتھ آپ کی شفقت، دشمنوں کے مقابلے میں آپ کا عزم اور عبادت میں آپ کی شب بیداری یہ سب قرآن کے مختلف مقامات پر نمایاں ہوتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ کے اپنے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمانے کو محفوظ فرمایا:
﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (سورۃ التوبۃ: ۴۰)
ترجمہ: ”غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“
یہ محض ایک تاریخی جملہ نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے غیر معمولی توکل اور پختہ عزم کی تصویر ہے۔

☆ رحمت، شفقت اور امت کی خیر خواہی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو امت کے ساتھ بے مثال شفقت ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمایا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾

ترجمہ: "تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے، وہ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے نہایت شفیق و مہربان ہیں۔" (سورۃ التوبہ: ۱۲۸)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتی تڑپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ (سورۃ الكهف: ٦)

ترجمہ: "شاید آپ ان کے پیچھے غم میں اپنی جان کھو بیٹھیں گے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت محض ایک تبلیغی ذمہ داری نہیں تھی؛ آپ انسانوں کی ہدایت کے لیے دل کی گہرائیوں سے فکرمند تھے۔

☆ نرم مزاجی اور حسنِ معاشرت:

قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نرم مزاج ہونے کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت قرار دیا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۵۹)

ترجمہ: "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم دل ہیں، اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔"

سیرت کا مطالعہ اس آیت کی عملی تفسیر سامنے لاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر وہ لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھے جنہوں نے برسوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ستایا تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقام کے بجائے عمومی عفو و درگزر کا راستہ اختیار فرمایا۔ یوں قرآن میں بیان کردہ عفو، رحمت اور حسنِ معاشرت سیرت میں عملی صورت اختیار کرتے ہیں۔

☆ عبادت میں قرآن کی عملی تفسیر:

قرآن نماز قائم کرنے، روزہ رکھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور حج کا حکم دیتا ہے، مگر ان عبادات کی عملی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے امت کو سکھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي"۔

ترجمہ: "نماز اسی طرح پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" (صحیح البخاری، حدیث: 631)

حج کے بارے میں فرمایا: "خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ"۔

ترجمہ: "اپنے حج کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔" (صحیح مسلم، حدیث: 1297)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے اجمال کو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تفصیل اور عملی شکل عطا کرتی ہے۔

☆ سیرت کے قرآنی مطالعے کی ضرورت:

قرآن کی متعدد سورتیں اور آیات سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص واقعات اور مراحل سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ سورۃ الانفال

میں غزوۂ بدر کے حالات، سورۃ الأحزاب میں غزوۂ خندق اور ازواجِ مطہرات سے متعلق بعض احکام، سورۃ النور میں واقعۂ افک، سورۃ المنافقون میں منافقین کے رویے اور سورۃ التوبہ میں غزوات اور منافقین کے متعدد حالات کا ذکر ملتا ہے۔

اسی طرح سورۃ النصر میں دین کی نصرت اور لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کے بعد نبی ﷺ کو تسبیح و استغفار کا حکم دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کی طرف اشارہ سمجھا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل موجود ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب التفسیر، حدیث: 4970)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو اس کے تاریخی اور سیرتی پس منظر سے الگ کر کے پڑھنے سے اس کے بہت سے اشارات اور لطائف نظروں سے اوجھل رہ سکتے ہیں۔

☆ قرآن متن ہے، سیرت اس کی عملی صورت:

سیرتِ نبوی ﷺ اور قرآن کے تعلق کو ایک جملے میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اصول و ہدایات دیتا ہے اور رسول اللہ ﷺ ان اصولوں کو انسانی زندگی میں نافذ کر کے دکھاتے ہیں۔ قرآن عدل کا حکم دیتا ہے، سیرت عدل کی عملی مثالیں پیش کرتی ہے؛ قرآن عفو و رحمت کی تعلیم دیتا ہے، سیرت اس کا عملی نمونہ دکھاتی ہے؛ قرآن صبر و توکل کی دعوت دیتا ہے، سیرتِ نبوی ﷺ مکی دور کی پوری جدوجہد میں اس کی زندہ تصویر بن جاتی ہے۔

اسی لیے سیرت کا مطالعہ صرف تاریخی واقعات جاننے کا نام نہیں، بلکہ قرآن کے عملی مفاہیم کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

☆ سیرت کا قرآنی مطالعہ: ایک مستقل علمی جہت:

علمائے سیرت اور مفسرین نے مختلف انداز سے قرآن اور سیرت کے اس تعلق پر کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں "محمد عزۃ دروزۃ" کی معروف عربی کتاب "سيرة الرسول: صور مقتبسة من القرآن الكريم وتحليلات ودراسات قرآنية" خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں قرآنِ کریم کی آیات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مختلف مراحل اور پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد بن محمد ابو شہبہ کی "السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة" بھی قرآن و سنت کی روشنی میں سیرت کے مطالعے کی اہم کتاب ہے۔

یہ طرزِ مطالعہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ سیرت کو صرف تاریخی ترتیب سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ قرآن کی روشنی میں سیرت اور سیرت کی روشنی میں قرآنی واقعات کو بھی سمجھا جائے۔

☆ ہماری ذمہ داری:

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مقصد صرف یہ جان لینا نہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں کیا واقعات پیش آئے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن کے ان اصولوں کو اپنی زندگی میں کیسے اتارا جائے جن کی کامل عملی تصویر ہمیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (سورۃ الأحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔"

لہٰذا قرآن سے ہمارا تعلق اس وقت کامل ہوگا جب قرآن کی تعلیمات ہماری زندگی میں اخلاق و کردار کی صورت میں ظاہر ہوں، اور اس کے لیے سب سے بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ ضروری ہے، اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے قرآنِ کریم سے بہتر کوئی بنیادی ماخذ نہیں۔ قرآن اور سیرت ایک دوسرے سے جدا نہیں؛ قرآن ہدایت کا متن ہے اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ہدایت کی سب سے کامل عملی تصویر۔

مراجع و مصادر:

1۔ القرآن الكريم، خصوصاً: القلم: 4، التوبہ: 40، 80، 128; آل عمران: 159; الكہف: 6; الأنبياء: 107; الأحزاب: 21; النصر: 1-3۔

2۔ البخاري، محمد بن إسماعيل، الجامع الصحيح، كتاب التفسير، حديث: 4970; نيز حديث: 631۔

3۔ مسلم بن الحجاج، الصحيح، كتاب صلاة المسافرين، حديث: 746; نيز كتاب الحج، حديث: 1297۔

4. دروزة، محمد عزة، سيرة الرسول: صور مقتبسة من القرآن الكريم وتحليلات ودراسات قرآنية، مطبعة الاستقامة، القاهرة۔

5. أبو شهبة، محمد بن محمد، السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة۔

6. الطبري، محمد بن جرير، جامع البيان عن تأويل آي القرآن، متعلقہ آیات کی تفاسیر۔

7. ابن کثیر، إسماعيل بن عمر، تفسير القرآن العظيم، متعلقہ آیات کی تفاسیر۔

8. ابن هشام، عبد الملك، السيرة النبوية، واقعاتِ سیرت کے تاریخی پس منظر کے لیے۔

9. ابن القيم، محمد بن أبي بكر، زاد المعاد في هدي خير العباد، سیرت و ہدیِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں کے لیے۔

☆☆☆☆☆

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کردیا۔
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کردیا۔
خود نہ تھے راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے۔
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا۔
(اکبرالہ آبادی)

سیرت نبویؐ میں مشاورت (شوریٰ) کی اہمیت

ابوفائزہ ذاکرحسین الریاضی

اسلامی سیاست کا ایک اہم باب اس کا شورائی نظام ہے، سیاسات اسلامی کی معراج وتکمیل شورائیت کے بغیر ناممکن ہے۔شورائی نظام کوخارج کردینے کے بعد اسلامی سیاست ایک تن بے روح اور گلِ بے بو کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔

اور آج ہم ایسے ہی مسئلہ سے ابتداء کرتے ہیں جس سے ذوی العقول کے تمام افراد کو بہ فرق مراتب سابقہ پڑتا ہے امور خانہ داری سے معاملات مہمہ سلطنت تک اس سے مستغنی نہیں ہیں۔

کون نہیں جانتا ہے کہ مشورہ محمود، اور اس کا کاربند ہونا ہلاکت وپشیمانی سے نجات دینے والا طریق صواب کو منکشف کرکے فوز وفلاح تک پہنچانے والا ہے۔کامیابی اور حصول مقاصد کی کنجی یہی ہے، اسی طرح استبداد واستقلال وخودداری کے مضر ومہلک نتائج اور اس کے مذموم وقبیح ہونے سے کون سا مرد ناواقف ہے۔

مشورہ کو اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، سورہ آل عمران (۱۵۹) میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے: "وشاورهم في الأمر" اور اے نبی! ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔یعنی ان کو شریک مشورہ رکھو۔اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا صرف جاہلیت کا طریقہ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے: "وأمرهم شورى بينهم" (سورہ شوریٰ ۳۸) ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایمان واقامت صلوۃ کے ساتھ کا تذکرہ اس کی جلالت شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ امت مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابند ہے۔{احکام القرآن ج ۳ ص ٤٧٥}

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے روبرو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعہ اسے طے کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی بھی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملہ پر ایک رائے نہیں ہوجاتے اقدام نہیں کرتے۔{تفسیر کبیر ج ۷ ص ٤١٥}

احادیث ایک اور پہلو اس موقع پر ہمارے سامنے ابھار لاتی ہیں وہ یہ کہ دنیا میں جتنی تباہیاں اور ہلاکتیں پیدا ہوئی ہیں ان سب کا سرچشمہ خواہشات نفس اور اس کے سفلہ جذبات کا اتباع ہے۔بعض افراد اور بعض طبیعتوں کے بارے میں تو یہ اندیشہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ رذیل فطرت اور صراط مستقیم سے منحرف ہوجائیں گے لیکن پوری امت محمدیہ کے بارے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی وقت وہ من حیث المجموع صداقت وراستی کی راہ سے پلٹ جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا تجتمع أمتي على

ضلالة"میری امت کبھی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔

امام شاطبی رحمہ اللہ نے فرماتے ہیں: انفرادی رائے سے اجتماعی رائے؛ جو باہمی مشورہ سے طے پائی ہو زیادہ نافع ہے اس لیے کہ ایک فرد کے جذبات وخواہشات سے مغلوب ہوجانا عین ممکن ہے لیکن کسی جماعت کا مبتلائے ہوا وہوس ہوجانا ناممکن ہے۔ خصوصیت سے اعلی مناصب اور شریعت کے بلندتر مراتب میں فرد کا ہوا وہوس سے محفوظ رہنا دشوارتر ہے۔{الاعتصام ج۳ ص۹۹}

اسی حقیقت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:"رأس العقل بعد الإيمان والتودد إلى الناس ومايستغني رجل عن مشورة"{سنن الکبری للبیهقي ج۱۰ص ۱۰۹}

ترجمہ:"ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل مندی لوگوں سے محبت ہے اور آدمی مشورہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔"

شوریٰ کے بے شمار فوائد اور اس کے ناقابل تصور نتائج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیل کے الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے: "المشاورة حصن من الندامة وأمان من الملامة"(المدخل لابن الحاج المتوفى ۷۳۷ھ ج ٤ ص ٤١) مشورہ کرنا شرمندگی سے محفوظ رہنے کا ایک قلعہ ہے اور ملامت سے بچنے کی ایک امان گاہ ہے۔

اسی ضمن میں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اور آپس میں علمی مذاکرہ کرنا خیر وبرکت کی کلید اور رحمت کا دروازے ہیں کیونکہ ان دونوں کے اختیار کرنے کے بعد کسی رائے کے بھٹک جانے اور حزم واحتیاط سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔

(المدخل لابن الحاج، ج٤ ص٤١)

حضرت عمر رحمہ اللہ نے اپنی وفات سے پہلے خلافت کے معاملہ کو جن چھ اشخاص کی کمیٹی کے حوالہ کیا تھا کہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں، اس کمیٹی سے خطاب کرکے فرماتے ہیں:"فمن تأمر منكم على غير مشورة من المسلمين فاضربوا عنقه"{طبقات ابن سعد القسم الاول ج۳ ص۲۵۰}

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کی پیشکش کی تو آپ نے جواب دیا۔ یہ کام رواروی اور جلدبازی میں طے کرنے کا نہیں ہے، حضرت عمر کی متعین کردہ شوریٰ موجود ہے وہ باہمی مشورہ سے کسی کو امیر منتخب کرے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شوریٰ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملکی مسائل کبھی تمام اہل مدینہ کے براہ راست مشورے سے طے کرتے اور کبھی گفتگو مہاجرین وانصار کے نمائندوں تک محدود رہتی، بنیادی اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی اور دوسری صورت میں اہل مدینہ کی رضا کا باعث ہوتی۔

نمائندگان قبائل: دور جاہلیت کے قبائلی نظام میں ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا، اسلام نے اس نظام کو برقرار رکھا اور مناسب اصلاح کے بعد اپنے اعلی معیار اور مقصد کے لیے استعمال کیا۔ جس وقت انصار نے بیعت عقبہ میں آنحضرت کی حمایت ونصرت کا حلف اٹھایا تھا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا کہ تم اپنے نمائندوں کو پیش کرو جو اپنی اپنی قوم کی تائید وحمایت کا ذمہ دار بنے، چنانچہ اسی وقت وفد مدینہ نے قبیلۂ خزرج کی مختلف شاخوں کے نو ۹ اور قبیلۂ اوس کے تین ۳ نمائندے پیش کیے جنھوں نے وفاداری ونصرت کا عہد کیا۔{سیرت ابن ہشام ص ۲۹۷، تاریخ کامل ج۲ ص ٤٠}

اسی طرح جنگ ہوازن میں مال غنیمت اور بہت سارے قیدی عسکری اسلام کے ہاتھ آئے اسلامی ضابطہ کے مطابق ان قیدیوں کو غازیوں کی ملکیت قرار دیا، بعدازاں قبیلۂ ہوازن نے دربار رسالت میں اپنے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست غازیان اسلام کے روبرو رکھی اور اس سلسلہ میں سفارش فرمائی جس پر ساری فوج کی جانب سے آمادگی کا اظہار ہونے لگا لیکن اس سے واضح طور پر یہ پتا نہیں چلا کہ کون اس پر آمادہ ہے اور نہیں۔

اس لیے آپ نے فرمایا: "**إنا لا ندري من أذن منكم في ذلك ممن لم يأذن فارجعوا حتى يرفع إلينا عرفاءكم أمركم فرجع الناس وكلهم عرفاءهم ثم رجعوا إلى رسول الله فاخبروه أنهم قد طيبوه**" {بخاري كتاب المعازي، باب قول الله ويوم حنين، وسيرت ابن هشام ص ۸۸۸}

اس واقعہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ دور رسالت میں باقاعدہ عوام کے نمائندے پائے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ عوام کے خیالات اور ان کی مرضی وناراضی کے ترجمان ہوتے تھے۔ تیسری یہ کہ آنحضرت قوم کے رجحانات سے واقف ہوئے بغیر کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔

اس قسم کی اور بھی بہت ساری تصریحات پیش کی جاسکتی ہیں، کہنے کا منشا صرف اس قدر ہے کہ دور رسالت میں باضابطہ ارباب حل وعقد موجود تھے جن سے آپ ہمیشہ مشورہ فرماتے تھے،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب وروز کے ایک رفیق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "**ما رأيت أحدا أكثر مشورة من رسول الله**"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ (امام ترمذی نے اس حدیث کو بلا سند نقل کیا، باب ما جاء في المشورة، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے سند پیش کی ہے گو کہ اس میں ارسال ہے، لیکن فقہاء اور محدثین نے جس کثرت سے اس روایت کو قبول کیا ہے اس سے یہ نقص بہت تک کم ہوجاتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ ہمیں باہمی پیچیدہ معاملات کو مشورے حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

☆☆☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق اور ہر فضیلت ونیکی کو جامع شخصیت میں ہمارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔"

(ماخذ: دار ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ)

سیرت نبویؐ اور دعوت وتبلیغ کے حکیمانہ اصول

ابوفریحہ مقیم عالم الریاضی

☆ **آپ ﷺ کا نسب عدنان تک:** محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اہل سیر وانساب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ پہلا حصہ جس پر سب کا اتفاق ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک ہے۔ دوسرے حصہ میں اختلاف ہے، یعنی عدنان کے والد ''اُدو'' سے لے کر قیدار بن اسماعیل علیہ السلام تک اور تیسرا حصہ اسماعیل سے آدم علیہما السلام تک۔

☆ **آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم:** حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب، رسول اللہ ﷺ کے والدِ محترم تھے۔ آپ قریش کے معزز خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد عبدالمطلب مکہ کے نہایت باوقار اور بااثر سردار تھے۔ حضرت عبداللہ اپنی پاکدامنی، حسنِ اخلاق، دیانت داری اور عمدہ کردار کی وجہ سے قریش میں نہایت محبوب تھے۔ حضرت عبداللہ کا نکاح حضرت آمنہ بنت وہب رضی اللہ عنہا سے ہوا، جو قریش کے معزز خاندان بنو زہرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ ایک مبارک رشتہ تھا، جس سے اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ نکاح کے کچھ عرصہ بعد حضرت عبداللہ تجارت کے سلسلے میں شام گئے۔ واپسی پر یثرب (مدینہ منورہ) میں اپنے ننھیالی رشتہ داروں بنو نجار کے ہاں قیام کیا، جہاں وہ بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً پچیس (25) سال تھی۔ رسول اللہ ﷺ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اپنے والد کی شفقت حاصل نہیں کی۔

حضرت عبداللہ نے اپنی وفات کے وقت چند اونٹ، چند بکریاں اور حضرت اُمِّ ایمن (برکہ رضی اللہ عنہا) کو بطور میراث چھوڑا۔ بعد میں حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی پرورش اور خدمت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت عبداللہ کی زندگی اگرچہ مختصر تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ عظیم سعادت عطا فرمائی کہ وہ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے والد بنے۔ ان کا پاکیزہ کردار، اعلیٰ نسب اور نیک صفات سیرتِ نبوی کا ایک اہم حصہ ہیں اور مسلمانوں کے لیے احترام ومحبت کا باعث ہیں۔

☆ **والدہ آمنہ بنت وہب:** عبداللہ کے والد نے ان کی شادی آمنہ بنت وہب بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب سے کر دی، اُس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔ آمنہ مکہ کی افضل ترین عورتوں میں سے تھیں، اور عبداللہ کے ساتھ نسب میں چوتھی پشت میں مل جاتی تھیں، اور ان کے والد وہب بنو زہرہ کے سردار اور اشرافِ قریش میں سے تھے۔ وہ چھوٹی تھیں تبھی ان کے والد وفات پا گئے، تو ان کی کفالت ان کے چچا وہیب نے کی، جو اپنے بھائی کی طرح اپنی قوم کے سردار تھے۔

☆ **دودھ پلانے والی عورتیں:** نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی والدہ کے علاوہ دودھ پلانے کی سعادت تین عورتوں کو حاصل ہوئی۔

(1) اُمّ ایمن برکہ حبشیہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے والد کی وفات کے بعد آمنہ کے بطن سے پیدا ہوئے تو امّ ایمن رضی اللہ عنھا ان کی دیکھ بھال کرنے لگیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد

کردیا (صحیح مسلم، کتاب الجھاد: حدیث (1771)۔

(2) ثویبہ ابولہب کی لونڈی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ماں کے ساتھ آپ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے بھی دودھ پلایا تھا، جن کی گود میں اُس وقت اُن کا بیٹا مسروح پرورش پا رہا تھا، اس سے پہلے ثویبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب کو دودھ پلایا تھا، اور آپ کے بعد ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو بھی دودھ پلایا۔ یہ بات حلیمہ سعدیہ کے ساتھ آپ کے بنی سعد جانے سے پہلے کی ہے۔

(3) حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنھا: دودھ پلانے والی عورتیں مکہ کے گرد ونواح سے مناسب اوقات میں ایسے دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکہ آتی تھیں جن کے والدین سے انہیں زیادہ اجرت کی توقع ہوتی تھی، کچھ قبائل اور گھرانے دودھ کی کثرت، آب وہوا کی بہتری، اور فصاحت وبلاغت میں مشہور تھے۔ انہی میں سے قبیلۂ ہوازن میں بنی سعد کے گھرانے کا شمار ہوتا تھا جو بالخصوص اپنی زبان کی فصاحت میں مشہور تھا۔

☆ **والدہ کی وفات اور دادا کی کفالت:** بنی سعد سے واپس آنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ماں کے پاس رہنے لگے، اور اللہ کی حفاظت وحمایت میں آپ کی پرورش وپرداخت ہونے لگی، حتی کہ آپ کی عمر کا چھٹا سال پورا ہوگیا۔ اس وقت آمنہ نے یثرب (مدینہ منورہ) کے بنی عدی بن نجار میں اپنے بیٹے کے ننھیال والوں کی زیارت کرنی چاہی۔ اُن کا ارادہ اپنے شوہر کی قبر کو بھی دیکھنا تھا؛ چنانچہ وہ اپنے بیٹے اور اپنی خادمہ امّ ایمن رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوکر تقریباً چار سو پچاس کلومیٹر کی مسافت طے کرکے یثرب پہنچیں، وہاں ایک ماہ قیام کیا، پھر مکہ کے لیے واپس لوٹ گئیں، راستہ میں مکہ اور یثرب (مدینہ منورہ) کے درمیان "ابوا" نامی مقام پر بیمار پڑ گئیں، اور وہیں وفات پا گئیں، اور اسی جگہ دفن کردی گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدہ برہ امّ ایمن رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ واپس آ گئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باپ اور ماں دونوں طرف سے محروم ویتیم ہو چکے تھے، لیکن حفاظتِ الٰہی اور عنایتِ ربانی آپ پر ہر جانب سے سایہ فگن تھی۔ مکہ پہنچنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے جب آپ کو امّ ایمن رضی اللہ عنھا سے اپنی گود میں لیا تو آپ کو دیکھ کر بہت ہی زیادہ غمگین ومتأثر ہوئے، اور ماں اور باپ دونوں جانب سے آپ کی یتیمی کے سبب آپ کو اپنے بیٹوں پر ترجیح دینے لگے، اور غایت درجہ ان کا خیال رکھنے لگے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکات اور اٹھنے بیٹھنے کی ادا کو دیکھ کر نہایت خوش ہوتے۔ عبدالمطلب نے لمبی عمر پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوئی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے ہوئے تو ان کی وفات ہوگئی۔ مقبرۂ حجون میں دفن کردیے گئے۔ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے پوتے کی کفالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے ذمے لگا دیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ کے سگے بھائی تھے۔

☆ **ابوطالب کی کفالت میں:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کے پاس پلتے بڑھتے جوان ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرتا رہا، اور ابوطالب نے اپنے بھتیجے کا حق پورے طور پر ادا کیا۔ انہوں نے آپ کو اپنی اولاد کے ساتھ ملا لیا، اور آپ کو ان سب پر فوقیت دینے لگے۔ جب آپ آٹھ سال کے تھے اس وقت سے نبوت کے دسویں سال تک پورے تینتالیس (43) سال انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا خیال رکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا، ہر طرح سے آپ کی راحت وآرام کا خیال کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ نبوت کے مطابق آپ کی عزت کی۔

☆ **ابتدائے وحی:** حضرت جبریل علیہ السلام ربّ العالمین کی طرف سے وحی لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غارِ حرا میں حالتِ بیداری میں آئے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: پڑھیئے، تو آپ نے فرمایا: مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر جبریل علیہ السلام نے مجھے پکڑ لیا، اور زور سے بھینچا، پھر چھوڑ دیا، اور کہا: پڑھیئے۔ میں نے کہا: مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ جبریل علیہ السلام نے مجھے تیسری بار پکڑ لیا، اور زور سے بھینچا، پھر چھوڑ دیا، اور کہا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿1﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿2﴾ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿3﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿4﴾ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق: 1-5)

"اے پیغمبر! آپ پڑھیئے، اپنے رب کے نام سے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا ہے، اس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا ہے، پڑھیئے، اور آپ کا رب بے پایاں کرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم دیا، اس نے آدمی کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے فوراً واپس آ گئے، اُس وقت آپ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اور کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے آپ کو کمبل اوڑھا دیا، اور کچھ دیر کے بعد آپ کا خوف جاتا رہا۔ آپ نے خدیجہ رضی اللہ عنہ کو پوری بات بتائی، اور کہا: میں اپنے بارے میں ڈر گیا ہوں، خدیجہ نے کہا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، مجبوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں کے لیے کسبِ معاش کرتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں، اور حق کے کاموں میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

☆ **نزولِ وحی کی صورتیں:** (1) کبھی وحی گھنٹی کی تیز آواز کی مانند آتی۔ اور وحی کی یہ نوعیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید ترین ہوتی تھی۔ جب وحی ختم ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبینِ مبارک پر پسینے کے قطرے دکھائی دیتے، اور آپ جبریل علیہ السلام کے ذریعہ نازل کردہ اللہ کے کلام کو یاد کر چکے ہوتے۔

(2) کبھی فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کی شکل میں آ کر کلام کرتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کر لیتے۔

(3) کبھی کبھار وحی کا بوجھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہلکا ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رات کا کھانا کھاتے وقت وحی نازل ہوتی، اور گوشت والی ہڈی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتی، آپ کا احساس پوری طرح باقی رہتا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر اٹھاتے، اور اپنے رب کی طرف سے نازل شدہ احکام شرعیہ کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے۔ (صحیح البخاری: حدیث (146، 4795)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ ہم سب کو کرنا چاہیئے، یہاں ہر چیز کو لکھ نہیں سکتا ہوں، جیسا کہ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کچھ لمحات کو مختصر بیان کیا، اب اخیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واقعہ مختصر بیان کریں گے، پھر میں میرا موضوع کا دوسرا حصہ مختصر قلمبند کروں گا۔

☆ **آپ کی وفات اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت:** رسول اللہ ﷺ اپنی آخری بیماری میں شدید کمزوری کی وجہ سے نماز کے لیے تشریف نہ لا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کی امامت کرائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کئی دن تک نماز پڑھاتے رہے۔ بعد میں جب آپ ﷺ کی طبیعت میں کچھ افاقہ ہوا تو دو صحابہ کے سہارے مسجد تشریف لائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹنے لگے مگر آپ ﷺ نے انہیں اپنی جگہ قائم رہنے کا

اشارہ فرمایا۔ پھر آپ ﷺ ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا کرتے رہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ؐ کی اقتدا کرتے تھے اور مقتدی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کے مقام و فضیلت کی واضح دلیل ہے۔

☆**موت کی سختیاں:** امّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنھا کہا کرتی تھیں: مجھ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے یہ بھی ایک انعام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں وفات پائی، اور میری باری کے دن، اور میرے گلے اور میرے سینے کے درمیان، اور موت کے وقت اللہ تعالیٰ نے میرے اور اُن کے تھوک کو جمع کر دیا۔ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ (میرے بھائی) میرے پاس آئے، اُن کے ہاتھ میں مسواک تھی، اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دیے ہوئی تھی، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں، میں سمجھ گئی کہ ان کو مسواک چاہیے، میں نے پوچھا: اِسے آپ کے لیے لے لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں۔ میں نے مسواک آپ ؐ کو دی تو آپ کے لیے وہ سخت تھی۔ میں نے پوچھا: اِسے نرم بنا دوں؟ آپ ﷺ نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں۔ میں نے اسے نرم بنا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے منہ میں گھمایا، آپ ؐ کے سامنے ایک برتن میں پانی رکھا تھا، آپ اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال کر انہیں اپنے چہرہ پر پھیرتے تھے اور کہتے تھے: لا الٰہ الا اللہ، بے شک موت کی سختیاں ہوتی ہیں، آپ نے پھر اپنا ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگے: اے اللہ! رفیق اعلیٰ کی طرف بلا لے، یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پا گئے، اور آپ ؐ کا دستِ مبارک جُھک گیا۔ (البخاري، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: (4449)

☆**دعوت و تبلیغ کے حکیمانہ اصول:**

اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو انسانیت کی ہدایت اور اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا۔ ان کا بنیادی فریضہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا، انہیں خیر و بھلائی کی راہ دکھانا اور برائی سے روکنا تھا۔ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے دعوت و تبلیغ کا یہ عظیم فریضہ نہایت حکمت، بصیرت، صبر اور حسنِ اخلاق کے ساتھ انجام دیا۔ آپ ﷺ کی دعوت میں نرمی اور شفقت، کی رعایت اور اخلاص نمایاں تھی۔ یہی اصول ہر دور کے داعی کے لیے کامیابی کی بنیاد ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (سورۃ النحل: 125)

ترجمہ: "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت، عمدہ نصیحت اور بہترین انداز سے گفتگو کے ذریعے دعوت دو۔"

☆**دعوت و تبلیغ کا مفہوم:** دعوت کے لغوی معنی بلانا، پکارنا، جبکہ شرعاً: لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید، دینِ اسلام، نیکی اور تقویٰ کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا ہے۔ جس کی دلیل:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (سورۃ آل عمران: 104)

ترجمہ: "تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔"

☆**دعوت و تبلیغ کے چند اصول:**

(1) اخلاص: دعوت کی پہلی شرط اخلاص ہے۔ داعی کی نیت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہونی چاہیے، نہ کہ شہرت، منصب یا دنیاوی مفاد۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ﴾ (سورۃ یوسف: 108)

ترجمہ: "کہہ دیجیے! یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔"

(2) علم و بصیرت: بغیر علم کے دعوت نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ داعی کو قرآن، سنت اور دینی مسائل کا صحیح علم ہونا چاہیے۔ رسول ﷺ نے فرمایا "بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً" "میری طرف سے (لوگوں تک) پہنچاؤ، خواہ ایک ہی آیت ہو۔" (بخاری)

(3) حکمت: حکمت سے مراد ہر شخص کے مزاج، حالات اور عقل کے مطابق مناسب انداز اختیار کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہر فرد سے اس کی کیفیت کے مطابق گفتگو فرمائی، اسی لیے آپ کی دعوت دلوں میں اترتی تھی۔

(4) نرم مزاجی اور حسنِ اخلاق: دعوت میں سختی کے بجائے نرمی اختیار کرنا سنتِ نبوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ﴾ (سورۃ آل عمران: 159)

ترجمہ: "اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم مزاج بن گئے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَه" (صحیح مسلم)

ترجمہ: "نرمی جس چیز میں ہوتی ہے اسے خوبصورت بنا دیتی ہے۔"

(5) صبر و استقامت: دعوت کی راہ آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے سخت مخالفت کے باوجود صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (سورۃ الأحقاف: 35)

ترجمہ: "آپ اسی طرح صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔"

(6) مخاطب کی رعایت: داعی کو مخاطب کی علمی، ذہنی اور معاشرتی حالت کا خیال رکھنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں سے ایسی بات نہ کرو جسے ان کی عقلیں قبول نہ کر سکیں، ورنہ وہ بعض باتوں کو جھٹلا دیں گے۔

(7) تدریج: اسلام کی تعلیمات مرحلہ وار نازل ہوئیں۔ اسی طرح دعوت میں بھی تدریج اختیار کرنا سنتِ نبوی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا کہ سب سے پہلے لوگوں کو توحید کی دعوت دینا، پھر نماز اور اس کے بعد زکوٰۃ کی تعلیم دینا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔

(8) عمل سے دعوت: داعی کا کردار اس کی دعوت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اگر عمل اور دعوت میں تضاد ہو تو دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ "تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟" (سورۃ الصّف: 2)

سیرتِ نبوی ﷺ سے چند مثالیں: نبی کریم ﷺ نے طائف میں شدید تکالیف برداشت کرنے کے باوجود بددعا نہیں کی بلکہ ان کی ہدایت کی دعا فرمائی۔ فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کو عام معافی دے کر دنیا کو بتایا کہ حقیقی داعی انتقام نہیں بلکہ اصلاح چاہتا ہے۔ یہی حکمت، حلم اور رحمت آپ کی دعوت کی کامیابی کا راز تھے۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو پڑھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اپنی زندگی کو اسکے مطابق ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نیز دعوت و تبلیغ کے اصول و ضوابط کو صحیح طور پر سمجھنے، ان پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے اور حکمت و بصیرت کے ساتھ دینِ اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کی توفیق دے آمین!

☆☆☆☆☆

میثاقِ مدینہ: دنیا کا اولین تحریری سماجی معاہدہ

مولانا ضیاء الحق سلفی — کبیر نگر، جمشید پور

انسانی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک امن، استحکام اور ترقی کی منزل طے نہیں کر سکتا جب تک اس کے افراد کے درمیان حقوق و فرائض واضح نہ ہوں، قانون سب پر یکساں نافذ نہ ہو اور مختلف طبقات کے مابین باہمی اعتماد قائم نہ ہو۔ جب معاشرہ قبائلی تعصب، مذہبی کشمکش، معاشی ناہمواری اور سیاسی انتشار کا شکار ہو جائے تو ایک ایسے اجتماعی معاہدے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو سب کو ایک مشترکہ نظام کے تحت جمع کر سکے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ منورہ کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اوس اور خزرج کی طویل قبائلی جنگیں، یہودی قبائل کے سیاسی و معاشی مفادات، مہاجرین کی نئی آمد اور مختلف مذہبی و سماجی گروہوں کی موجودگی نے ایک پیچیدہ معاشرتی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ ایسے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عظیم مدبر، عادل رہنما اور کامیاب ریاست ساز کی حیثیت سے ایک ایسی تاریخی دستاویز مرتب فرمائی جس نے مدینہ کے منتشر معاشرے کو ایک منظم، پرامن اور باوقار سماج میں تبدیل کر دیا۔ یہی دستاویز "صحیفۂ مدینہ" یا "میثاقِ مدینہ" کے نام سے معروف ہے۔

بہت سے مسلم اور غیر مسلم مؤرخین اس دستاویز کو دنیا کے اولین جامع تحریری سماجی معاہدوں میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ اس میں پہلی مرتبہ مختلف قبائل اور مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی حقوق، ذمہ داریاں، ریاستی وفاداری، عدالتی نظام، اجتماعی دفاع اور امنِ عامہ کے اصول ایک ہی تحریری دستاویز میں جمع کیے گئے۔ اگرچہ قدیم تہذیبوں میں بعض قانونی ضابطے پہلے سے موجود تھے، لیکن کثیر مذہبی اور کثیر قبائلی معاشرے کے لیے اس نوعیت کا جامع سماجی معاہدہ اپنی مثال آپ ہے۔

(۱) میثاقِ مدینہ کا تعارف:

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے مختلف قبائل اور طبقات کے درمیان ایک تحریری معاہدہ مرتب فرمایا۔ اس میں مہاجرین، انصار اور یہودی قبائل کے باہمی تعلقات، حقوق، ذمہ داریوں اور ریاستی نظم کے اصول بیان کیے گئے۔ امام ابن ہشام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "وَكَتَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ كِتَابًا بَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ، وَادَعَ فِيهِ يَهُودَ وَعَاهَدَهُمْ"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک تحریری معاہدہ لکھوایا، اس میں یہودیوں کو بھی شامل فرمایا اور ان سے باقاعدہ عہد کیا۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، 1 / 501) امام ابوعبید القاسم بن سلام نے الأموال میں، امام ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں اور دیگر مؤرخین نے بھی اس معاہدے کو نقل کیا ہے، جس سے اس کی تاریخی اہمیت مزید واضح ہوتی ہے۔

(۲) میثاقِ مدینہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟:

مدینہ منورہ اس وقت مختلف مذہبی اور قبائلی گروہوں کا مرکز تھا۔ مسلمان دو بڑے طبقات یعنی مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھے، جبکہ یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ بھی وہاں آباد تھے۔ اس کے علاوہ چند مشرک قبائل بھی موجود تھے۔ اوس اور خزرج

کی باہمی جنگوں نے معاشرتی امن کو تباہ کر رکھا تھا۔ جنگِ بعاث کے زخم ابھی تازہ تھے۔ ہر قبیلہ اپنی برتری چاہتا تھا اور کوئی مشترک قانونی نظام موجود نہیں تھا۔ اگر ان حالات میں مضبوط سماجی معاہدہ نہ بنایا جاتا تو نوخیز اسلامی ریاست مسلسل اندرونی انتشار کا شکار رہتی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسا معاہدہ مرتب فرمایا جس نے قبائلی وابستگیوں کو قانون کی حدود میں لایا، تمام شہریوں کی ذمہ داریاں متعین کیں، مذہبی آزادی کو تسلیم کیا، جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی اور مدینہ کو ایک منظم سیاسی و سماجی وحدت میں تبدیل کر دیا۔ یہی میثاقِ مدینہ کی سب سے بڑی تاریخی اور تمدنی اہمیت ہے۔

(۳) میثاقِ مدینہ: ایک سماجی انقلاب:

میثاقِ مدینہ صرف ایک قانونی دستاویز نہیں تھا بلکہ ایک خاموش سماجی انقلاب تھا۔ اس نے نسب، قبیلے اور نسل کی بنیاد پر تقسیم شدہ معاشرے کو قانون، عدل اور باہمی ذمہ داری کی بنیاد پر متحد کیا۔ پہلی مرتبہ یہ تصور پیش کیا گیا کہ ریاست کے تمام باشندے، اپنے اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کے ساتھ، ایک مشترک سماجی نظم کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میثاقِ مدینہ کو اسلامی تہذیب کا پہلا اجتماعی عمرانی منشور بھی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے نے یہ واضح کر دیا کہ اسلامی ریاست کی بنیاد ظلم، جبر اور نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ عدل، وفائے عہد، امنِ عامہ، اجتماعی ذمہ داری اور انسانی وقار پر قائم ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے مدینہ کے منتشر معاشرے کو مختصر مدت میں ایک مثالی اسلامی معاشرے میں تبدیل کر دیا۔

(۴) میثاقِ مدینہ کے نمایاں سماجی اصول:

میثاقِ مدینہ کا اصل مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل تھا جہاں ہر فرد قانون کا پابند ہو، ہر طبقے کو انصاف ملے اور مختلف مذاہب و قبائل باہمی احترام کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اس معاہدے کی چند اہم دفعات درج ذیل ہیں:

(۱) ایک متحدہ معاشرے کا قیام: رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے مہاجرین اور انصار کو ایک امت قرار دیا، ارشاد ہوا "إِنَّهُمْ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِنْ دُونِ النَّاسِ" یہ سب دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ایک امت ہیں۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، 1/503)

یہ دفعہ اس حقیقت کا اعلان تھی کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد نسل، رنگ یا قبیلہ نہیں بلکہ ایمان، عدل اور مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس نے صدیوں پرانے قبائلی تعصب کو ختم کر کے ایک نئی اجتماعی شناخت عطا کی۔

(۲) مذہبی آزادی اور بقائے باہمی: میثاقِ مدینہ نے غیر مسلم شہریوں کو ان کے مذہبی معاملات میں آزادی دی۔ صحیفہ میں ہے "لِلْيَهُودِ دِينُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ" یہودی اپنے دین پر رہیں گے اور مسلمان اپنے دین پر۔ (ابن ہشام، 1/504)

یہ دفعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی ریاست میں مذہبی اقلیتوں کے مذہبی حقوق محفوظ ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ ریاست کے وفادار رہیں اور معاہدے کی پابندی کریں۔

(۳) جان، مال اور عزت کا تحفظ: کسی بھی مہذب معاشرے کی بنیاد انسانی جان و مال کا تحفظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا:

"إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ" تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام

ہے۔(صحیح البخاری) میثاقِ مدینہ نے اسی اصول کو عملی قانون کی شکل دی۔

(۴) قانون کی حکمرانی: میثاقِ مدینہ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ کسی فرد یا قبیلے کو قانون سے بالاتر نہیں رکھا گیا۔ اختلافات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی عدالت کے مطابق ہوگا "وَإِنَّ مَرَدَّهُ إِلَى اللّٰهِ وَإِلَى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ" (ابن ہشام، 1/ 505) یہ اسلامی ریاست میں عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی کی روشن مثال ہے۔

(۵) اجتماعی دفاع: میثاق کی ایک اہم دفعہ یہ تھی کہ اگر مدینہ پر بیرونی حملہ ہوگا تو تمام معاہدہ کرنے والے فریق متحد ہو کر دفاع کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی سلامتی صرف حکومت نہیں بلکہ پورے معاشرے کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

(۶) ظلم اور جرم کی سرپرستی کی ممانعت: صحیفۂ مدینہ میں واضح کیا گیا: "وَأَنَّهُ لَا يُجِيرُ مُجْرِمًا" کوئی شخص کسی مجرم کو پناہ نہیں دے گا۔ (ابن ہشام، 1/ 505) اس اصول نے سفارش، قبائلی جانبداری اور مجرموں کی پشت پناہی کا راستہ بند کر دیا۔

(۵) میثاقِ مدینہ کے سماجی اثرات:

میثاقِ مدینہ کے نفاذ کے بعد مدینہ منورہ میں نمایاں تبدیلیاں آئیں:

۱- قبائلی جنگوں کا خاتمہ ہوا۔

۲- قانون کی حکمرانی قائم ہوئی۔

۳- مختلف مذاہب کے درمیان پر امن ۴- بقائے باہمی وجود میں آئی۔

۵- جان و مال کو تحفظ حاصل ہوا۔

۶- اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا۔

۷- اسلامی ریاست کو استحکام حاصل ہوا۔

۸- عدل و انصاف کو عملی صورت ملی۔

یہی وہ مضبوط بنیاد تھی جس پر بعد میں اسلامی تہذیب کی عظیم عمارت قائم ہوئی۔

آج دنیا امن، انسانی حقوق اور مذہبی رواداری کے دعوے کرتی ہے، لیکن عملی طور پر تعصب، نسلی امتیاز، مذہبی منافرت اور سیاسی مفادات کے باعث عالمی امن خطرے میں ہے۔ ایسے حالات میں میثاقِ مدینہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ پائیدار امن صرف طاقت سے نہیں بلکہ عدل، قانون کی بالادستی، معاہدوں کی پاسداری، مذہبی آزادی اور باہمی احترام سے قائم ہوتا ہے۔

یہ معاہدہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اسلام ظلم یا جبر کا نہیں بلکہ انصاف، ذمہ داری اور سماجی توازن کا دین ہے۔

میثاقِ مدینہ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی بصیرت، سماجی حکمت اور عدل پر مبنی قیادت کا ایسا روشن شاہکار ہے جس نے ایک منتشر معاشرے کو متحد امت میں تبدیل کر دیا۔ یہ صرف ایک تاریخی معاہدہ نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ایک دائمی پیغام ہے کہ مضبوط معاشرہ وہی ہوتا ہے جو قانون، انصاف، وفائے عہد، انسانی احترام اور اجتماعی ذمہ داری کی بنیاد پر قائم ہو۔

آج امتِ مسلمہ اور پوری دنیا اگر میثاقِ مدینہ کے ان سنہری اصولوں کو سمجھ کر اپنی اجتماعی زندگی میں نافذ کرے تو نفرت کی جگہ محبت، انتشار کی جگہ اتحاد اور ظلم کی جگہ عدل قائم ہو سکتا ہے۔ یہی میثاقِ مدینہ کا اصل پیغام اور اس کی دائمی اہمیت ہے۔

مراجع و مصادر:

ابن ہشام، السيرة النبوية
ابن إسحاق، السيرة (برواية ابن ہشام).
ابن كثير، البداية والنهاية.
أبو عبيد القاسم بن سلام، الأموال.
صحيح البخارى. و صحيح مسلم

☆☆☆☆☆

نعتِ نبی ﷺ

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تُو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

کلام: احمد فراز

ازقلم: اظہرالدین سلفی

نبوی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق: ایک تاریخی وقانونی مطالعہ

حقوقِ انسانی کے مباحث میں سے، حقوقِ اقلیت ایک نہایت اہم اور حساس موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جدید دنیا، مذہبی آزادی، شہری مساوات، جان و مال کے تحفظ اور انسانی وقار کو بنیادی انسانی حقوق قرار دیتی ہے۔لیکن اگر تاریخِ انسانی کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو ایک مربوط دینی وریاستی نظام کی صورت میں سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایسی ریاست قائم فرمائی؛ جس میں مذہبی اختلافات کے باوجود غیر مسلم شہریوں کی جان، مال، عزت، عبادت گاہوں اور شہری حقوق کی حفاظت کو قانونی ضمانت حاصل تھی۔

اسلام نے غیر مسلموں کو صرف برداشت کا حق نہیں دیا، بلکہ عدل، احسان، وفاء عہد، حسنِ معاشرت اور انسانی کرامت جیسے آفاقی اصولوں کے تحت ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی تعلیم دی۔ یہی وجہ ہے کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ اور دیگر معاہد اقوام کے ساتھ ایسا منصفانہ اور رحیمانہ طرزِ عمل اختیار فرمایا؛ جو اس دور کے سیاسی و مذہبی نظاموں میں اپنی مثال آپ تھا۔

اسلام میں اقلیتوں کے حقوق محض نظری بحث نہیں بلکہ قرآنِ کریم کی ہدایات، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدات اور خلفائے راشدین کے عملی فیصلوں سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اور ساتھ ہی اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (سورۃ الممتحنة:8)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، ان کی والدہ قتیلہ جو اس وقت مشرکہ تھیں مدینہ آئیں، حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آیا وہ اپنی غیر مسلم والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نعَمْ، صِلِي أُمَّكِ"۔ "ہاں، اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔"

اس واقعہ کے تناظر میں یہ آیت نازل ہوئی، جس نے واضح کر دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کرتے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے غیر مسلموں کے ساتھ برّ (نیکی) اور قسط (عدل) کا حکم دیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ اور ظلم کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔

اور یہی بات حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایسے غیر مسلموں کے ساتھ احسان اور عدل

کی اجازت دیتا ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ نہ ہوں۔ جیسے عورتیں، کمزور افراد اور پرامن لوگ۔ اسی طرح اس آیت کریمہ سے ایک بنیادی اسلامی اصول سامنے آتا ہے کہ اختلافِ مذہب، عدل و احسان کی نفی نہیں کرتا۔ اسلام نے عقیدے کے اختلاف کو انسانی حقوق سلب کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ پرامن غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، عدل، صلہ رحمی اور معاشرتی تعاون کو دینی قدر قرار دیا۔ یہی قرآنی اصول بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عملی اقدامات، خصوصاً میثاقِ مدینہ، معاہداتِ نبوی اور غیر مسلم وفود کے ساتھ حسنِ سلوک میں پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔

قرآن مجید نے اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مذہبی آزادی، عدل اور انسانی وقار کو بھی اسلامی معاشرے کے بنیادی اصول قرار دیا۔ یہی اصول بعد میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مکمل عملی صورت اختیار کرتے ہیں، وہی مذہبی آزادی قرآنی اصول میں سے ہے۔ ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (سورۃ البقرۃ: 256)

ترجمہ: "دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ تفسیر ابن کثیر میں فرماتے ہیں:

"لَا تُكْرِهُوا أَحَدًا عَلَى الدُّخُولِ فِي دِينِ الْإِسْلَامِ، فَإِنَّهُ بَيِّنٌ وَاضِحٌ، جَلِيٌّ دَلَائِلُهُ وَبَرَاهِينُهُ"۔

کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرو، کیونکہ اسلام اپنی دلیلوں اور براہین کے اعتبار سے بالکل واضح ہے۔

(ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورۃ البقرۃ، آیت: 256)

امام ابو جعفر طبری رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو اختیار اور یقین پر قائم کیا ہے، اس لیے جبر کے ذریعے کسی کو مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ (الطبری، جامع البیان، تفسیر سورۃ البقرۃ، آیت: 256)

اس قرآنی اصول کی بہترین عملی مثال نجران کے عیسائی وفد کا واقعہ ہے۔ نو ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نہایت وقار اور احترام سے گفتگو فرمائی، انہیں اسلام کی دعوت دی، ان کے شبہات کا جواب دیا، لیکن انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں فرمایا بعد میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت ان کی جان، مال، عبادت گاہوں اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ذکر وفد نجران؛ ابن القیم، زاد المعاد، ج 3)

یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا دعوتی منہج حکمت دلیل اور حسنِ خطاب پر قائم ہے، نہ کہ جبر و اکراہ پر۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اختلافِ مذہب کے باوجود معاہدین کے حقوق کا پورا احترام فرمایا

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد کلام میں عدل و انصاف کا حکم بھی دیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (سورۃ النحل: 90)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هَذِهِ الْآيَةُ مِنْ أَجْمَعِ آيَاتِ الْقُرْآنِ لِلْخَيْرِ كُلِّهِ"۔

یہ آیت قرآنِ کریم کی ان جامع ترین آیات میں سے ہے جو تمام خیر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

(القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، تفسیر سورۃ النحل، آیت: 90)

مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاقِ مدینہ کے ذریعے ایک ایسی اجتماعی ریاست قائم فرمائی؛ جس میں مسلمانوں

اور یہودی قبائل کے درمیان حقوق و فرائض واضح کیے گئے ہیں۔ اس معاہدے میں ہر فریق کی جان و مال کے تحفظ، انصاف اور باہمی تعاون کو ریاستی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ یہ معاہدہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری بھی قانون کے تحفظ اور عدل کے مساوی حق دار ہوتے ہیں۔

(ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، صفی الرحمن مبارکپوری، الرحیق المختوم)

ہجرت کے بعد میثاقِ مدینہ دنیا کی اولین تحریری ریاستی دستاویزات میں شمار کیا جاتا ہے؛ جس میں مذہبی تنوع کے باوجود اجتماعی امن، عدل، معاہدہ کی پابندی اور شہری حقوق کی حفاظت کو آئینی حیثیت دی گئی۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بعد میں اسلامی فقہ میں اہلِ ذمہ اور معاہدین کے حقوق کی تفصیلی بحث قائم ہوئی۔

قرآنی نصوص اور نبوی اسوہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کو محض اخلاقی نصیحت کے طور پر نہیں بلکہ ایک شرعی، قانونی اور معاشرتی ذمہ داری کے طور پر پیش کیا۔ اسی قرآنی بنیاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور فیصلوں کے ذریعے مزید واضح فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرَ حْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا"۔

جس شخص نے کسی معاہد (غیر مسلم شہری) کو ناحق قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ، باب إثم من قتل معاهداً حدیث:3166)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم کی جان بھی اسی طرح قابلِ احترام ہے جیسے کسی دوسرے شہری کی محض مذہبی اختلاف کسی کی جان لینے کا جواز نہیں بن سکتا۔

حدیث مبارکہ میں اہلِ ذمہ پر ظلم کی ممانعت کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهَدًا، أَوِ انْتَقَصَهُ، أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ، أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"۔

ترجمہ: "خبردار! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کا حق کم کیا، اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا یا اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لیا، تو قیامت کے دن میں اس کے خلاف مدعی ہوں گا۔" (سنن ابی داود، کتاب الخراج وال إمارۃ، حدیث:3052)

اس حدیث میں صرف ظلم سے منع نہیں کیا گیا بلکہ معاشی استحصال ناجائز ٹیکس، جبری مشقت اور حقوق تلفی کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت اقلیتوں کے قانونی اور معاشرتی تحفظ کی ضامن ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ سے ایک روشن مثال پیش خدمت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ ﷺ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: أَلَيْسَتْ نَفْسًا؟ کیا وہ ایک انسان نہیں تھا؟ (صحیح بخاری، حدیث:1312، صحیح مسلم، حدیث:961)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانی عظمت اور احترامِ آدمیت کا دین ہے۔ اگرچہ عقیدہ اور دین کے اعتبار سے مسلمان اور غیر مسلم میں فرق ہے، لیکن انسان ہونے کے اعتبار سے ہر شخص عزت و احترام کا مستحق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام معاہدات میں وفائے عہد کی عملی مثال قائم فرمائی۔خواہ میثاقِ مدینہ ہو، حدیبیہ کا معاہدہ ہو یا نجران کے عیسائیوں سے طے پانے والا معاہدہ، ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد کی پابندی کو اسلامی اخلاق کا بنیادی حصہ قرار دیا۔

قرآن نے بھی فرمایا:﴿وَأَوۡفُوا بِالۡعَهۡدِ ۖ إِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُولًا﴾(سورۃ الإسراء: 34)

ترجمہ:"عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی۔"

احادیثِ نبویہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کو محض اخلاقی نصیحت کے طور پر نہیں بلکہ شرعی ذمہ داری قرار دیا ہے۔جان و مال کا تحفظ، ظلم سے اجتناب، وفائے عہد اور انسانی احترام ایسے اصول ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات اور اپنے عملی نمونے دونوں کے ذریعے امت کے لیے لازم قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین نے انہی قرآنی تعلیمات اور نبوی ہدایات کو اپنے نظامِ حکومت میں نافذ فرمایا۔ان کے فیصلے اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق اسلام میں محض نظری اصول نہیں بلکہ عملی دستور۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک روز مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے۔آپ ؓ نے ایک ضعیف اور نابینا یہودی کو لوگوں سے سوال کرتے دیکھا۔آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم اس حالت میں کیوں ہو؟ اس نے جواب دیا کہ بڑھاپے، محتاجی اور جزیہ کی ذمہ داری نے اسے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے تم سے جوانی میں جزیہ لیا اور اب بڑھاپے میں تمہیں بے سہارا چھوڑ دیں، یہ انصاف نہیں۔

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے بیت المال کے ذمہ دار کو حکم دیا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے ضرورت مند اہلِ ذمہ کے لیے بیت المال سے مستقل وظیفہ مقرر کیا جائے اور ان سے جزیہ بھی معاف کر دیا جائے۔(ابو یوسف، کتاب الخراج؛ ابن زنجویہ، کتاب الأموال)

یہ واقعہ اسلامی ریاست کے فلاحی تصور کو واضح کرتا ہے۔اسلام میں بیت المال صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شہری کے لیے ہے جو ریاست کے تحفظ میں رہتا ہو اور ضرورت مند ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ معاشی عدل اور انسانی ہمدردی پر قائم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک زرہ گم ہوگئی کچھ عرصہ بعد وہ ایک یہودی کے پاس ملی۔آپ ؓ نے معاملہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش کیا۔قاضی نے حضرت علی ؓ سے شرعی گواہ طلب کیے۔چونکہ مطلوبہ شہادت پوری نہ ہو سکی، اس لیے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا گیا۔

یہودی نے جب دیکھا کہ اسلامی عدالت میں خلیفۂ وقت کے خلاف بھی انصاف کیا جا رہا ہے تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اعتراف کیا کہ زرہ دراصل حضرت علی ؓ ہی کی ہے، پھر اسلام قبول کر لیا۔ (ابن القیم، الطرق الحکمیہ؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ)

یہ واقعہ اس اصول کو واضح کرتا ہے کہ اسلامی عدلیہ میں فیصلے منصب یا مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ دلیل اور شرعی شہادت کی بنیاد پر

ہوتے ہیں۔یہی حقیقی عدل ہےجس نے غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی عظمت پیدا کی۔

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے دورِ خلافت میں تمام معاہدات کی پابندی کی۔شام، عراق اور مصر کے غیر مسلم باشندوں سے کیے گئے معاہدوں میں ان کی عبادت گاہوں، اموال اور جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔فقہائے اسلام نے انہی علمی نظائر کی بنیاد پر اہلِ ذمہ کے حقوق کی تفصیلی بحث قائم کی ہے۔اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری کی جان و مال محفوظ ہے۔

عدل و انصاف مذہب کی بنیاد پر تبدیل نہیں ہوتا۔

ریاست ضرورت مند اقلیتوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔

عدالت میں مسلمان اور غیر مسلم قانون کے سامنے برابر ہیں۔

معاہدات کی پابندی اسلامی اخلاق اور ریاستی ذمہ داری دونوں ہے۔

یہی وہ اصول ہیں جو سیرتِ نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ کو انسانی حقوق کی تاریخ میں ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔اور یہی اصول بعد کے فقہائے اسلام نے اپنی تصنیفات میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

قرآنِ مجید، سنتِ نبوی ﷺ اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے عملی نمونوں کی روشنی میں فقہائے اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کے متعلق نہایت متوازن اور عادلانہ اصول بیان کیے ہیں۔ان کا مقصد اسلامی ریاست میں امن، عدل اور وفائے عہد کو برقرار رکھنا تھا۔امام ابن حزم رحمہ اللہ (456ھ) لکھتے ہیں:

"اگر اہلِ ذمہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے دفاع کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کریں، کیونکہ وہ اسلامی ریاست کے عہد و امان میں ہیں۔" (ابن حزم، مراتب الاجماع؛ نیز المحلی، باب أحکام أهل الذمة)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (728ھ) فرماتے ہیں کہ:

"عدل ہر شخص کے ساتھ واجب ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور ظلم ہر ایک پر حرام ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

یہ اصول ان کی متعدد تصنیفات میں نمایاں ہے، جہاں وہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد عدل پر ہے اور ظلم کسی حال میں جائز نہیں۔" (ابن تیمیہ، مجموع الفتاوۃ۔)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید علامہ ابن القیم رحمہ اللہ (751ھ) اپنی کتاب اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی شریعت کی بنیاد عدل، رحمت، حکمت اور بندوں کی مصلحت پر قائم ہے، لہٰذا ہر وہ بات جو عدل کے خلاف ہو، وہ شریعت کے مقاصد کے موافق نہیں۔" (إعلام الموقعین)

ائمۂ سلف کے ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کوئی سیاسی رعایت نہیں بلکہ شریعت کے مقاصد (مقاصد الشریعہ) کا حصہ ہیں۔جان، مال، عزت، مذہبی آزادی اور عدل و انصاف ایسے اصول ہیں جن کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کو وحیِ الٰہی کی بنیاد پر محفوظ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کے جان، مال، عزت اور مذہبی آزادی کی عملی ضمانت فراہم

کی۔

میثاقِ مدینہ انسانی تاریخ کے اولین تحریری معاہدات میں سے ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے شہری حقوق کی حفاظت کی گئی۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ غیر مسلم شہری پر ظلم، اس کے حقوق غصب کرنا یا اس کی جان کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔

خلفائے راشدینؓ نے سیرتِ نبوی ﷺ کو عملی طور پر نافذ کیا اور عدل و انصاف کی بے مثال مثالیں قائم کیں۔

فقہائے اسلام نے انہی نصوص کی بنیاد پر اہلِ ذمہ اور معاہدین کے حقوق کو اسلامی قانون کا مستقل باب بنایا۔

عصرِ حاضر میں اسلام پر اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے کیے جانے والے اعتراضات کا علمی جواب قرآن، سنت اور سیرتِ نبوی ﷺ کے صحیح مطالعہ میں موجود ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اسلام کا تصورِ عدل، مذہبی تعصب سے بالاتر اور انسانی کرامت پر مبنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی زندگی سے ثابت فرمایا کہ اختلافِ مذہب، ظلم کا جواز نہیں بن سکتا، بلکہ انصاف، وفائے عہد، حسنِ سلوک اور احترامِ انسانیت ہی اسلامی معاشرے کی اصل بنیاد ہیں۔ یہی وہ تعلیمات ہیں جنہیں خلفائے راشدینؓ اور ائمۂ اسلام نے آگے بڑھایا اور جن کی روشنی میں اسلامی تہذیب نے صدیوں تک مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو امن اور عدل فراہم کیا۔

☆☆☆☆☆

اگر اغیار نے ان کو جہاں سے محو کر دیا
قیامت تک نہ ہوگا کوئی تیرا پوجنے والا
الٰہی اب وہ عہد لیلۃ المعراج پورا کر
محمد سے جو وعدہ ہو چکا ہے آج پورا کر

سیرتِ نبوی ﷺ میں اقلیتوں کے حقوق

مولانا محمد سعود نجرانی حفظہ اللہ

کسی بھی معاشرے یا ریاست کے امن و امان اور انصاف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں کی اقلیتوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو کیا مقام اور حقوق حاصل ہیں۔

آج کے دور میں جہاں اقلیتوں کے حقوق کو نظر انداز کیا جارہا ہے، وہاں سے چودہ سو سال قبل محمد ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک ایسی ریاست قائم کی جس میں غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف مکمل مذہبی، جانی اور معاشی تحفظ فراہم کیا گیا بلکہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کی مکمل ضمانت دی گئی۔

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری کی روشن ترین مثال ہے۔ اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ذیل میں چند اہم نکات پیشِ خدمت ہیں:

1۔ عبادت گاہوں کی حرمت و تحفظ:

اسلام نے کبھی کسی پر جبر یا زبردستی عقیدہ مسلط کرنے کی اجازت نہیں دی۔ قرآنِ مجید کا بنیادی اصول ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۝ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾

ترجمہ: "دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔" (سورۃ البقرۃ:256)

سیرتِ نبوی میں اس کی عملی شکل نجران کے عیسائی وفد کا واقعہ اور ان کے ساتھ ہونے والا معاہدہ سیرتِ طیبہ میں اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری کی سب سے روشن اور تاریخی مثال ہے۔ جب نجران کا عیسائی وفد مدینہ آیا تو آپ ﷺ نے نہ صرف انہیں مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا بلکہ اپنے طریقے کے مطابق عبادت کی اجازت دی، اور معاہدہ تحریر فرمایا:

"لِنَجْرَانَ وَحَاشِيَتِهِمْ جِوَارُ اللهِ وَذِمَّةُ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ رَسُولِ اللهِ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَمِلَّتِهِمْ وَغَائِبِهِمْ وَشَاهِدِهِمْ وَعَشِيرَتِهِمْ وَبِيَعِهِمْ، وَكُلِّ مَا تَحْتَ أَيْدِيهِمْ مِنْ قَلِيلٍ أَوْ كَثِيرٍ"

"اور اہلِ نجران اور ان کے حواشی کے لیے اللہ کی پناہ اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے؛ ان کے اموال، ان کی جانوں، ان کے مذہب، ان کے غائب و حاضر، ان کے کنبے، ان کی عبادت گاہوں اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ میں ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ، ان سب کا تحفظ کیا جائے گا۔" (الطبقات الکبریٰ: وفد نجران، ج1، ص357؛ کتاب الخراج، ص:78)

2۔ جان و مال اور ناموس کا تحفظ:

ریاستِ مدینہ میں غیر مسلم اقلیتوں کی جان، مال اور آبرو کو مسلم شہریوں کے برابر قرار دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا، أَوِ انْتَقَصَهُ، أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ، أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

ترجمہ: "خبردار! جس کسی نے کسی معاہد (غیر مسلم شہری) پر ظلم کیا، یا اس کا حق مارا، یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی، یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی، تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے (اس مسلمان کے خلاف) مدعی اور مقدمہ لڑنے والا ہوں گا۔" (سنن ابی داؤد، کتاب الخراج حدیث:3052)

ایک اور حدیث میں غیر مسلم ذمی کے ناحق قتل پر سخت وعید بیان فرمائی:

"مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا"۔

ترجمہ: "جس شخص نے کسی معاہد (غیر مسلم شہری) کو (ناحق) قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے۔" (صحیح البخاری، حدیث:3166)

3۔ میثاقِ مدینہ: مساوی شہریت اور ساجھے داری:

ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے تمام اقوام، بالخصوص یہودی قبائل (بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ) کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کیا جسے "میثاقِ مدینہ" کہا جاتا ہے۔ اس تاریخی وثیقے میں اقلیتوں کو واضح شہری حقوق دیے گئے:

☆ **مساوی شہریت اور مذہبی آزادی:**

"وَإِنَّ يَهُودَ بَنِي عَوْفٍ أُمَّةٌ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ، لِلْيَهُودِ دِينُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ، مَوَالِيهِمْ وَأَنْفُسُهُمْ"۔

ترجمہ: "اور بنو عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ مل کر ایک ہی قوم (امت/سماج) ہیں؛ یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین، ان کے موالی اور ان کی جانیں برابر کی حقدار ہیں۔" (السیرۃ النبویۃ، ج1 ص:503)

☆ **مشترکہ دفاع کی ذمہ داری:**

"وَإِنَّ بَيْنَهُمُ النَّصْرَ عَلَى مَنْ حَارَبَ أَهْلَ هَذِهِ الصَّحِيفَةِ... وَإِنَّ الْيَهُودَ يُنْفِقُونَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ مَا دَامُوا مُحَارَبِينَ"۔

"اور اس صحیفہ کے تمام فریقین پر لازم ہے کہ جو شخص بھی اس میثاق کے ماننے والوں کے خلاف جنگ کرے گا وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور جب تک جنگ رہے گی یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اخراجات اٹھائیں گے۔" (السیرۃ النبویۃ، ج1، ص ۵۰۳-۵۰۴)

4۔ معاشی مراعات اور سوشل سیکیورٹی:

اسلامی ریاست میں اقلیتوں سے دفاعی خدمت کے بدلے میں ایک معمولی معاشی ٹیکس "جزیہ" لیا جاتا تھا، لیکن اگر کوئی غیر مسلم بوڑھا، معذور یا نادار ہو جاتا تو اس کا جزیہ نہ صرف معاف ہوتا بلکہ بیت المال سے اس کی کفالت کی جاتی۔

معاہدہ حیرۃ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے نبی کریم ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں تحریر فرمایا:

"وَجَعَلْتُ لَهُمْ: أَيُّمَا شَيْخٍ ضَعِيفٍ عَنِ الْعَمَلِ، أَوْ أَصَابَتْهُ آفَةٌ مِنَ الْآفَاتِ، أَوْ كَانَ غَنِيًّا فَافْتَقَرَ وَصَارَ أَهْلُ دِينِهِ يَتَصَدَّقُونَ عَلَيْهِ، طُرِحَتْ جِزْيَتُهُ وَعِيلَ مِنْ بَيْتِ مَالِ الْمُسْلِمِينَ وَدَارِ هِجْرَتِهِمْ"۔

"اور میں نے ان کے لیے یہ شق بھی رکھی ہے کہ: ان کا کوئی بھی بوڑھا جو کام کرنے سے عاجز ہو گیا ہو، یا اس پر کوئی آفت آ گئی ہو، یا وہ پہلے امیر تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اسے صدقہ دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور

اس کی اوراس کے عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔ (کتاب الخراج،ص:144)

اسی اصول پر سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک نادار یہودی کو دیکھ کر فرمایا تھا:

"ما أَنْصَفْنَاكَ أَنْ أَخَذْنَا مِنْكَ الْجِزْيَةَ فِي شَبَابِكَ ثُمَّ نَخْذُلُكَ فِي كِبَرِكَ"

"ہم نے تم سے انصاف نہیں کیا کہ تمہاری جوانی میں تم سے جزیہ لیا اور تمہارے بڑھاپے میں تمہیں لاوارث چھوڑ دیا)، اور اس کا وظیفہ بیت المال سے جاری فرمایا۔" (کتاب الخراج،ص126

5۔سماجی رواداری اور حسنِ سلوک:

سیرتِ طیبہ میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ اخلاق اور انسانی احترام کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

جب مدینہ میں ایک غیر مسلم (یہودی) کا جنازہ گزرا تو نبی کریم ﷺ احترام میں کھڑے ہو گئے۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أَلَيْسَتْ نَفْسًا؟" کیا وہ ایک (انسانی) جان نہیں ہے؟ (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، حدیث:1312)

اور فتحِ مکہ کے موقع پر تمام سابقہ مظالم اور دشمنی کے باوجود آپ ﷺ نے قرآنی طرز پر عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: "لا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ"۔

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔)"

(سنن البیہقی الکبریٰ، ج9،ص118، حدیث:18055؛ السیرۃ النبویۃ، ج2،ص:412)

خلاصہ:

سیرتِ طیبہ میں اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری محض لفظی دعووں تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ ایک حکمت عملی تھی جس کی بنیاد قرآن و حدیث کے نصِ قاطع اور میثاقِ مدینہ جیسے تحریری دستاویزات پر رکھی گئی تھی۔آج کے دور میں جہاں دنیا کے مختلف حصوں میں اقلیتیں تعصب اور ناانصافی کا شکار ہیں، سیرتِ نبوی کے یہ عالمگیر اصول اور مستند احکام پوری دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔اگر جدید ریاستیں ان نبوی اصولوں کو اپنا لیں تو معاشرے سے تعصب، نفرت اور انتشار کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ اور دنیا بھر کے حکمرانوں کو سیرتِ نبوی کی روشنی میں عدل، انصاف اور رواداری قائم کرنے کی توفیق دے اور ہمارے معاشرے کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنائے۔آمین یارب العالمین!

☆☆☆

خطبۂ حجتہ الوداع اور جدید انسانی حقوق

مولانا محمد شمیم تیمی حفظہ اللہ

قارئین کرام! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک حج کیا۔ سن ۱۰ ہجری کے آخر میں، یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج ہے۔ سفر حج پر روانہ ہونے سے پہلے ہی منادی کرادی گئی تھی کہ اس سال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حج کرنے والے ہیں۔ اس لئے جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ لوگ بھی نکلیں۔ یہ مژدۂ جاں فزا سننا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جم غفیر اور ایک بڑی تعداد آپ کے ساتھ حج کرنے کے شوق میں نکل پڑی اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رہنمائی میں فریضۂ حج ادا کیا۔ حج بیت اللہ کے ساتھ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضۂ نصیحت و خیرخواہی کو بھی خوب تر انجام دیا۔ اسی لئے حج کے دوران پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خطبے ارشاد فرمائے جیسے یوم عرفہ کا خطبہ اور اس سال کے عید الاضحٰی کا خطبہ۔۔ یہ تمام خطبے کتب احادیث و سیرت میں "حجتہ الوداع" کے خطبے کے نام سے معروف ہیں۔

قارئین کرام! "خطبۂ حجتہ الوداع" کا معنیٰ ہے رخصت ہونے والے کے حج کا خطبہ یا پیغام یا بلفظ دیگر آخری حج۔ جیسا کہ مذکورہ سطور سے معلوم ہوا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج ہے کیونکہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے بلکہ دو مہینے اور چند ہی دن گزرے تھے کہ آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ خطبۂ حجتہ الوداع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے آخری اور اہم خطبوں میں سے ہیں جو انتہائی جامع اور ہمہ گیر ہیں، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی تعلیمات و ہدایات کے خلاصے کو بڑی عمدگی اور سلیقے سے پیش فرمایا

قارئین کرام! مذکورہ خطبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج و معاشرہ میں بسنے والے ہر طبقے کے لوگوں کے حقوق بیان فرمائے خاص طور سے بیوی کے حقوق، شوہر کے حقوق، خادموں اور لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید، ذمیوں اور معاہدوں کے حقوق وغیرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے حقوق بیان کرنے کے ساتھ ہی ہر قسم کی جاہلی رسم و رواج اور سماجی و اخلاقی برائیوں کے خاتمے پر بھی پورا زور دیا۔

محترم قارئین! حقوق کی فہرست میں اگر حقوق انسانی کو شامل نہ کیا جائے تو وہ فہرست ادھوری اور نامکمل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ محسن انسانیت اور حقوقِ انسانی کے سب سے بڑے محافظ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبے میں انسانی حقوق کو بھی خصوصیت کے ساتھ شامل کیا۔

حقوقِ انسانی کا معنیٰ: انسانی حقوق کا سیدھا اور صاف مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان اور مومن نہیں ہیں بلکہ کافر و مشرک اور بے دین ہیں، ان کے دین و مذہب سے صرف نظر کرتے ہوئے محض بحیثیتِ انسان اور بنی نوعِ آدم ان کے چند حقوق کو قبول اور تسلیم کرنا اور ان کو ادا کرنے کا پابند رہنا۔

قارئین کرام! دین اسلام بحیثیتِ انسان، انسان کے تین حقوق، حق زندگی، حق مال و جائیداد اور حق عزت و آبرو کو باضابطہ

اور واضح طور پر تسلیم کرتا ہے اور ان حقوق کی حفاظت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند حقوق ہو سکتے ہیں جیسے آزادی فکر وخیال یعنی اپنے دین پر عمل کی آزادی لیکن اس حق کو مذکورہ خطبے میں بیان نہیں کیا گیا ہے۔

آیئے خطبۂ حجۃ الوداع کی روشنی میں انسانی حقوق کا مطالعہ کرتے ہیں۔

١۔حق زندگی: زندگی کا حق ہر انسان کا بنیادی اور اولین حق ہے۔ دین اسلام میں انسانی جان کی حفاظت وصیانت کو جتنی اہمیت دی گئی ہے پوری انسانی تاریخ میں اتنی اہمیت کسی بھی دوسرے دین ومذہب میں نہیں دی گئی ہے۔ اسلام لوگوں کو زندگی دینے کے لئے آیا ہے اور ہر شخص کی زندگی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن لوگوں کو یہ کہتے ہوئے خطاب فرمایا کہ:

"يأيها الناس أي يوم هذا؟ قالوا: يوم حرام، قال: فأي بلد هذا؟، قالوا: بلد حرام، قال فأي شهر هذا؟ قالوا: شهر حرام. قال: فإن دماؤكم و أموالكم و أعراضكم حرام كحرمة يومكم هذا ،في بلدكم هذا ،في شهركم هذا، فأعادها مرارا ثم رفع رأسه فقال: اللهم هل بلغت ؟اللهم هل بلغت ؟ قال بن عباس رضي الله عنهما: فوالذي نفسي بيده إنها لوصيته إلى أمته، فليبلغ الشاهد الغائب، لا ترجعوا بعدي كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض "

ترجمہ: "اے لوگو! یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حرمت والا دن ہے، آپ نے فرمایا: یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ حرمت والا شہر ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ حرمت والا مہینہ ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہارے عزت وناموس کی حرمت ایسے ہی ہے جیسے اس دن کی حرمت اس شہر اور اس مہینے میں ہے۔ آپ نے اسے کئی بار کہا پھر آپ نے سر کو بلند کر کے فرمایا: اے اللہ کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ بے شک یہ آپ کی اپنے امت کو ایک عظیم وصیت ہے۔ حاضر غائب کو پہنچا دے۔ تم میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔" (اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے)

قارئین کرام! مذکورہ بالا حدیث پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کیا۔ آپ کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو کہ مسلمان اور مومن تھے، لیکن صیغۂ خطاب پر غور کریں گے تو یہ بات واضح ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ حدیث میں "يأيها الناس" کے صیغے سے خطاب کیا اور یہ صیغۂ عموم ہے جو تمام انسانوں کو شامل ہے، خواہ وہ مسلمان ومومن ہوں، کافر ومشرک ہوں، یہود ونصاری ہوں یا ملحد وبے دین تمام لوگ "الناس" میں داخل ہیں۔

محترم قارئین! حدیث مذکور کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان، مال اور آبرو کی حرمت دن شہر اور مہینے کی حرمت سے اس لئے مشابہت دی کیونکہ مخاطبین کے دل ودماغ میں ان کی حرمت بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی حرمت کی نہ صرف وہ پاس داری کرتے تھے بلکہ جو لوگ اس کی پاسداری نہیں کرتے تھے ان پر نکیر کرتے اور اسے عیب گردانتے تھے۔ پھر آپ نے پیشگی طریقۂ سوال کو اختیار کیا تاکہ انہیں اس حرمت کی یاددہانی کرا سکیں اور ان کے دلوں میں پہلے سے بیٹھی ہوئی حرمت کی روشنی میں اس چیز کو پوری تاکید سے بیان کر دیں جس کو آپ ان کے ذہنوں میں بٹھانا اور پیوست کرنا چاہتے تھے (فتح الباری ٣ / ٥٧٦ بحوالہ حجۃ الوداع کے خطبے اور نصیحتیں عبدالرزاق بن عبدالمحسن البدر)

قارئین محترم!

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں قتل ایک سنگین جرم اور کبیرہ گناہ ہے۔ اس کی خطرناکی اور سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ دین اسلام ایک بے قصور اور بے گناہ انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل اور ایک انسانی جان کی حفاظت کو پوری انسانیت کی حفاظت قرار دیتا ہے۔(المائدہ:۳۲)

یہاں تک کہ پیٹ میں پل رہے کسی جنین کو بھی چاہے وہ زنا ہی کی وجہ سے کیوں نہ حمل قرار پایا ہو، یا پھر زنا اور ناجائز تعلقات کی وجہ سے پیدا شدہ بچہ یعنی ولدالزنا کو بھی اسلام مارنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ہے بلکہ اسے بھی جینے کا پورا حق عطا کرتا ہے۔

ذمی کے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة ريحها، و إن ريحها ليوجد من مسيرة أربعين سنة"

ترجمہ:"جس شخص نے کسی معاہد اور ذمی (وہ شخص جو اسلامی حکومت میں جزیہ اور ٹیکس دے کر رہتا ہے) کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آرہی ہوگی"۔(صحیح بخاری: ٦٩١٤)

قارئین کرام! دین اسلام میں جس طرح یوم عرفہ، مکہ مکرمہ اور ماہ ذی الحجہ انتہائی مقدس اور قابل احترام ہے بالکل اسی طرح دنیا کا ہر انسان نہایت مقدس اور قابل عزت واحترام ہے۔ کسی بھی صورت میں اسے مارنے، ہلاک کرنے اور ضائع کرنے کو عظیم گناہ تصور کرتا ہے۔ بلکہ بلاتفریق مذہب ومسلک کسی کو بھی ایذا دینے اور تکلیف پہنچانے سے سختی سے منع کرتا اور روکتا ہے۔

۲۔ مال کے تحفظ کا حق: اسلامی حکومت میں بحیثیت انسان، ہر انسان کا دوسرا اہم اور بنیادی حق مال وجائیداد کے تحفظ کا حق ہے۔ **"لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون"**

ترجمہ:"اور تم اپنے اموال ناحق نہ کھاؤ اور نہ معاملہ حکام تک اس غرض سے پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ ناجائز طور پر جانتے ہوئے کھا جاؤ"

قارئین کرام! مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی رحمہ اللہ نے جلیل القدر صحابی عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ "یہ آیت کریمہ اس آدمی کے بارے میں ہے جس کے ذمہ کسی کا مال ہو، اور مال والے کے پاس کوئی دلیل نہ ہو، اس لئے وہ آدمی انکار کر بیٹھے اور معاملہ حاکم کے پاس لے جائے تاکہ فیصلہ اس کے حق ہو جائے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ گناہ گار ہے اور حرام کھانے پر تلا ہوا ہے۔ مزید آگے لکھتے ہیں کہ "لوگوں کا مال حرام طور پر کھانے کی بہت سی شکلیں ہیں جیسے کسی کا مال غصب کر لینا، چوری کرنا، امانت میں خیانت کرنا، سود کھانا، جوا کا مال کھانا، خرید وفروخت میں دھوکہ دینا، ایسے کام کی اجرت جسے ٹھیک سے نہیں کیا، عبادت پر اجرت لینا، زکوت، صدقہ، وقف اور وصیت کا مال ناحق کھا جانا یہ اور اس قسم کی وہ تمام صورتیں جن میں لوگوں کا مال ناحق کھایا جا رہا ہو وہ اکل حرام ہے، اور کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔"

قارئین محترم! مذکورہ بالا حرام کمائی کی ساری شکلیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، وہ ایک مسلمان پر حرام ہے چاہے وہ مال مسلمان کا ہو یا دوسرے دین ومذہب کے ماننے والے کا، اس میں کوئی تمیز اور تفریق نہیں کی گئی ہے بلکہ سبھوں کا مال ناجائز طور پر کھانا حرام ہے۔

قارئین کرام! حرام مال کی ایک بدترین شکل جو اس وقت بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے وہ سود ہے۔ کتاب وسنت میں اس کی

بڑی مذمتیں اور وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور گواہ بننے والے سبھوں پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ اس گناہ میں مبتلا تمام لوگوں کو گناہ اور جرم میں برابر کے شریک سمجھا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

"لعن الله آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، قال: هم سواء" (المسلم:۱۵۹۸)

جبکہ ایک دوسری حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کی قباحت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ سود کا سب سے ادنیٰ اور کم تر گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے:

"الربا ثلاثة وسبعون بابا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه" (صحيح الجامع:۳۵۳۹)

قرآن کریم سورۂ بقرہ کی ایک آیت کریمہ میں سودی لین دین اور کاروبار میں ملوث شخص کو تہدید اور دھمکی دی گئی ہے کہ اگر وہ سودی کاروبار اور لین دین نہ چھوڑے تو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے لئے تیار رہے (البقرہ:۲۷۹)

قارئین محترم! یہ دراصل ظلم اور مال حرام کھانے کی ایک بدترین شکل ہے جس سے امیر اور امیر ہوجاتے ہیں اور غریب اور غریب ہوجاتے ہیں۔خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے جڑ سے اس کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ: **"وربا الجاهلية موضوع، وأول ربا أضع من ربانا ربا عباس بن عبد المطلب، فإنه موضوع كله"** اور اس طرح ہر انسان کے مال کے تحفظ کو یقینی بنایا۔

۳۔عزت وآبرو کی حفاظت کا حق: انسان کا تیسرا بنیادی حق عزت واحترام کے تحفظ کا حق ہے۔عزت ہر شخص کو محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے بلکہ ایک غیرت مند انسان جان ومال کا ضیاع تو برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنی عزت وناموس پر کسی قسم کا دھبا لگنا گوارا نہیں کرتا ہے۔اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کے اس جذبہ اور احساس کا پورا اندازہ تھا۔اس لئے اس نے عزت ووقار پر بٹہ لگانے والی تمام چیزوں کی روک تھام کی ہدایت دی ہے۔دین اسلام میں زنا کاری، بدکاری، بہتان، الزام تراشی، جاسوسی ،ٹوہ اور عزت وحرمت کو پامال کرنے والی ہر چیز کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔انسانی عزت ووقار کے سب سے بڑا اور کھلا چیلنج اور انسان کے دامن پر لگنے والا سب سے بدنما داغ زنا ہے، اسلام اس کا ہی نہیں بلکہ اس کے تمام محرکات کا مخالف ہے تاکہ انسان کی عفت وپاکدامنی پوری طرح محفوظ رہے۔اس پر کسی قسم کا داغ دھبہ نہ لگے اور اس کی عزت پر حرف نہ آئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا کہ ﴿**ولا تقربوا الزنا إنه كان فاحشة وسآء سبيلا**﴾ (اسرائیل:۳۲)۔

قارئین کرام! موجودہ دور میں "انسانیت" کو دین اسلام اور دیگر ادیان کے مقابلے میں دین ومذہب کے طور پر متعارف اور پیش کیا جارہا ہے۔اور یہ باور کرایا جارہا ہے کہ انسان کے اندر انسانیت ہونی چاہیے کیونکہ انسانیت ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔ دراصل انسانیت کے نام پر اور اس کے آڑ میں دین اسلام جیسے پاکیزہ اور صاف ستھرا دین سے لوگوں کو پھیرنے اور برگشتہ کرنے کی منظم کوشش کی جارہی ہے۔اگر اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی کوئی بھی تعلیم انسانیت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات انسانیت سے کہیں اعلی اور اوپر ہے وہاں تک انسان نے تصور تک نہیں کیا ہے اس لیے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ اسلام ہی انسانی برادری کا حقیقی محافظ اور پاسبان ہے۔اس کا نعرہ ہے کہ **"فإن دماؤكم وأموالكم وأعراضكم حرام كحرمة يومكم هذا في بلدكم في شهركم هذا"**۔

قارئین کرام! پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد انسانی حقوق کے نام پر جو ادارے اور تنظیمیں قائم ہوئیں ان میں بھی یہی چار حقوق ،حق زندگی ،حق مال و جائیداد ،حق عزت و آبرو اور حق آزادیٔ مذہب کو تسلیم کیا گیا ہے۔ان تنظیموں نے تحریری طور پر مذکورہ حقوق ضرور عطا کئے ہیں لیکن آج تک وہ حقوق ٹھیک سے نافذ العمل نہیں ہو سکے۔اگر ہم اس بابت پوری دنیا خاص طور سے خلیجی اور اسلامی ممالک عراق، ایران شام، فلسطین، لبنان و یمن اور افغانستان کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ان ممالک میں سالہا سالہا سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بڑی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔انتہائی وحشیانہ اور بہیمانہ طریقے سے مخصوص دین و مذہب اور عقیدے کے لوگوں کو نشانہ بنا کر ان کی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش جا رہی ہے۔انہیں مارنے کے لئے انتہائی خطرناک اور زہریلے کیمیکل استعمال کئے جا رہے ہیں۔معصوم اور بے گناہ بچوں تک کو چھوڑا جا رہا ہے۔ گھروں، اسکولوں اور اسپتالوں کو مسمار کر کے کھنڈر میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔یعنی جان و مال اور دین و مذہب کچھ بھی محفوظ نہیں ہے ۔مذکورہ تمام انسانی حقوق کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ تنظیمیں اور ادارے یا تو خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مذمتی بیانات جاری کر کے اور ان کی حالت زار کو لوگوں کے سامنے لا کر اپنا پلہ جھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور عملی اقدامات صفر رہتا ہے جو کہ ان تنظیموں کے لئے انتہائی افسوس ناک ہے۔اس لئے ان نام نہاد انسانی تنظیموں پر ہمیشہ سے سوالیہ نشان لگتا رہا ہے؟ کہ کیا وہ ادارے اور تنظیمیں اپنے مقاصد میں ناکام ہیں؟ یا ان کے مقاصد کچھ ہیں؟

☆☆☆☆☆

اقوالِ زریں:

صورت سے زیادہ سیرت اہم ہے

کیونکہ خوبصورت چہرہ وقت کے ساتھ ڈھل جاتا ہے،

لیکن خوبصورت کردار ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عصرِ حاضر کے سماجی مسائل کا حل

مولانا محمد محمود عالیاوی

تمہید

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام انسانیت کی ہدایت، اصلاح اور فلاح کے لیے مبعوث فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے عملی رہنمائی کا کامل سرچشمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کو خُلقِ عظیم سے تعبیر فرمایا۔ عصرِ حاضر کے اخلاقی زوال، معاشرتی انتشار اور خاندانی و اقتصادی مسائل کے حل کے لیے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ سیرت سے وابستگی انسان کے ایمان، کردار، معاملات اور معاشرتی رویوں میں اصلاح پیدا کرتی ہے اور اسے عدل، رحمت، تقویٰ، اخوت اور خدمتِ خلق کا خوگر بناتی ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جامع تصور:

لفظ سیرت عربی زبان میں سارَ، یسیرُ سے مشتق ہے جو باب ضرَبَ، یضرِبُ سے آتا ہے۔ اس کے معنی چلنے پھرنے، چال چلن، کردار، سنت، طریقے، روش، شکل وصورت، ہیئت وغیرہ کے آتے ہیں۔

لفظ سیرت آغاز میں ہر ایک کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے، چنانچہ عوانہ بن حکیم کلبی (م ۱۴۷ھ) کی کتاب سیرت معاویہ و بنی امیہ، اور واقدی (م ۲۰۷ھ) کی کتاب سیرت ابی بکر و دفاتہ اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعد میں بھی لفظ سیرت کا یہ عمومی استعمال جاری رہا۔ البتہ اب ہمارے عرف اور عام محاورے میں جب لفظ صرف سیرت کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو انسانیت کے لیے کامل نمونہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "یقینا تمہارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔"

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی عظمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

اور بیشک تو بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔

اور جب عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ"

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔" (أخرجه أحمد (۲۵۸۱۳)، وابن سعد في ((الطبقات الكبرىٰ)) (۱/۳۶۴)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خبر جب سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے تحقیقِ احوال کے لیے اپنے بھائی کو مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا پھر جب وہ واپس لوٹا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں ان الفاظ میں بیان کی:

"رَأَيْتُهُ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الأَخْلَاقِ، وَكَلَامًا مَاهُو بِالشِّعْرِ"۔

وہ اچھے اخلاق کا لوگوں کو حکم کرتے ہیں اور میں نے ان سے جو کلام سنا وہ شعر نہیں ہے۔ (صحیح بخاري: 3861)

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "في علم المغازي علم الاخرة والدنيا" کہ علم مغازی (سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا و آخرت دونوں کا علم ہے۔ (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ج 3 ص: 242)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دراصل قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس قرآن کی تعلیم دی، اسی کو اپنی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد انسانوں کے تزکیۂ نفس اور اخلاقی و روحانی تربیت بھی تھا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب معاشرہ گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی جہالت، شرک، قبائلی عصبیت، ظلم، بدامنی، اخلاقی بے راہ روی اور کمزور طبقات کے استحصال کا شکار تھا۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا، طاقتور کمزور کا حق کھا جاتا اور معمولی قبائلی اختلافات نسلوں تک دشمنی میں بدل جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید، تقویٰ، عدل، رحمت، اخوت، مساوات، امانت اور انسانی احترام کی تعلیم دے کر اسی معاشرے کی فکری، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی کایا پلٹ دی۔

قرآن اس انقلاب کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا﴾ (سورہ آل عمران: 103)

"اور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمہیں بچا لیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ جو لوگ اسلام سے پہلے باہمی دشمنی، قبائلی عصبیت اور جاہلی رسم و رواج میں مبتلا تھے، وہ ایمان، ایثار، عدل اور اخوت کے علمبردار بن گئے۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے ہودج میں بیٹھی ہوئی ایک اکیلی عورت کو تو خود دیکھ لیا کہ حیرہ سے سفر کے لیے نکلی اور (مکہ پہنچ کر) اس نے کعبہ کا طواف کیا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی سے (ڈاکو وغیرہ) کا (راستے میں) خوف نہیں تھا اور مجاہدین کی اس جماعت میں تو میں خود شریک تھا جس نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے۔ اور اگر تم لوگ کچھ دنوں اور زندہ رہے تو وہ بھی دیکھ لو گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں (زکوٰۃ کا سونا چاندی) بھر کر نکلے گا (لیکن

اسے لینے والا کوئی نہیں ملے گا)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مال و دولت کی فراوانی کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی کہ مسلمانوں کو اللہ نے بہت دولت مند بنا دیا تھا کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ تھا۔

☆عصر حاضر کے اہم سماجی مسائل:

عصرِ حاضر میں انسانی معاشرہ مختلف سماجی، اخلاقی اور معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ اقتصادی ناہمواری، سودی وہ غیر منصفانہ معاشی نظام، حقوق کی پامالی، فرقہ واریت، تعصب، بدعنوانی، اور معاشی خودغرضی نے معاشرے میں طبقاتی فاصلے پیدا کیے ہوئے ہیں، دوسری طرف خاندانی نظام کا بگاڑ، والدین کی نافرمانی طلاق وگھریلو ناچاقی، صلہ رحمی میں کمی اور تربیت اولاد سے غفلت جیسے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح جھوٹ، خیانت، بے حیائی، عدمِ برداشت، نفرت، ظلم، حق تلفی اور خودغرضی اخلاقی بحران کو جنم دے رہے ہیں۔

جدید ذرائعِ ابلاغ اور سوشل میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ استعمال نے افواہوں، فتنہ انگیزی، وقت کی ضیاع اور غیر اخلاقی مواد کے پھیلاؤ کے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم معاشرے میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے عملی دوری پیدا ہو رہی ہے۔ سیرت کا ذکر تو موجود ہے، مگر اس کے اخلاق، معاملات، عدل، رحمت، امانت، تقویٰ اور حقوق العباد ہماری عملی زندگی میں مطلوبہ درجے تک نظر نہیں آتے۔ یہی نظریہ اور عمل کا فاصلہ بہت سے سماجی مسائل کی بنیادی وجہ ہے۔

☆سیرت نبوی کی روشنی میں ان مسائل کا حل:

عصرِ حاضر کے مذکورہ سماجی مسائل کا جامع اور پائیدار حل سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی پیروی میں مضمر ہے۔ اس کا آغاز تقویٰ اور تزکیۂ نفس سے ہوتا ہے؛ کیونکہ باطن کی اصلاح کے بغیر معاشرتی اصلاح ممکن نہیں۔ قرآنِ کریم نے نبوی مشن کا ایک بنیادی مقصد تزکیہ قرار دیا اور فرمایا:

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة: 2)

سیرت سے دوری کا علاج اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے؛ اسی لیے قرآن فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: 31) اور فرمایا: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: 80)

اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور فرمانبرداری میں ہی ان سماجی مسائل کا حل ممکن ہے

☆موجودہ دور میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عملی رہنمائی:

موجودہ دور میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنویت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب اس کے روشن اصول زندگی کے مختلف شعبوں میں جلوہ گر ہوں۔ علماء، ائمہ اور خطباء کے ذریعے سیرت کی تعلیم وتشریح معاشرے تک پہنچتی ہے، جبکہ اساتذہ اور تعلیمی ادارے نئی

نسل کے علم و کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین اور خاندان سیرت کے اخلاق و آداب کو گھریلو زندگی کا حصہ بنا کر نسلوں کی تربیت کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اسی طرح میڈیا اور سوشل میڈیا موجودہ زمانے میں سیرت کے پیغام کی ترویج کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ اگر سیرتِ طیبہ کے واقعات، اخلاقی تعلیمات اور معاشرتی اصولوں کو تحقیق، حکمت اور عصری اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے تو یہ پیغام بالخصوص نوجوان نسل کے دلوں تک مؤثر انداز میں پہنچ سکتا ہے۔ خود نوجوان نسل بھی سیرت سے صدق، امانت، حیا، محنت، والدین کی خدمت اور حسنِ سلوک جیسے اوصاف حاصل کر کے اپنی عملی زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: {بلغوا عني ولو آية} (صحيح بخاري: 3461) یہ تعلیم اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ نبوی تعلیمات کو صحیح علم اور ذمہ داری کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا بھی دینی خدمت اور عملی رہنمائی ہے۔

☆☆☆☆☆

"جو شخص آخرت کی بھلائی، دنیا کی دانائی، سیرت کی درستگی، تمام عمدہ اخلاق کا حصول اور تمام فضائل کا مستحق بننا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرے اور جہاں تک ممکن ہو، آپ کے اخلاق اور طریقۂ زندگی کو اختیار کرے۔"

(ابن حزم، الأخلاق والسير، ص۱۹)

حبِ وطن کی اہمیت سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

ابو ارسلان محمد وسیم نجرانی حفظہ اللہ

حبِ وطن، یعنی اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے محبت، انسان کی فطرت میں شامل کیا گیا ایک پاکیزہ اور فطری جذبہ ہے۔ انسان جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے، جہاں اس کا بچپن گزرتا ہے، جس کی فضاؤں میں وہ سانس لیتا اور جن لوگوں کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارتا ہے، اس کے ساتھ اس کا ایک فطری تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ یہی تعلق وقت گزرنے کے ساتھ محبت، الفت اور وابستگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے انسانی فطرت کے جائز جذبات کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ انہیں صحیح رخ عطا کیا ہے۔ وطن سے محبت بھی اسی فطری جذبے میں شامل ہے۔ البتہ اسلام نے وطن کی محبت کو ایسی عصبیت سے محفوظ رکھا ہے جس میں انسان حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لیے زندگی کے ہر شعبے میں بہترین نمونہ ہے۔ حبِ وطن کے حوالے سے بھی سیرتِ نبوی ﷺ میں نہایت روشن اور سبق آموز واقعات ملتے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے آپ ﷺ کی محبت، ہجرت کے وقت اس کی جدائی کا احساس، مدینہ منورہ سے محبت اور اس کے لیے دعائیں، اور معاشرے کے امن و استحکام کے لیے آپ ﷺ کی عملی جدوجہد ہمیں حبِ وطن کا متوازن اور پاکیزہ تصور عطا کرتی ہے۔

حبِ وطن کا مفہوم اور اسلامی نقطۂ نظر: لغت میں حب کے معنی محبت، الفت اور پسندیدگی کے ہیں، جبکہ وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان رہتا یا سکونت اختیار کرتا ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے حبِ وطن سے مراد اپنی سرزمین سے محبت، اس کے باشندوں کے ساتھ خیرخواہی، اس کی سلامتی اور ترقی کے لیے کوشش اور اس کے مفاد میں جائز کردار ادا کرنا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں وطن سے محبت کوئی مصنوعی یا نعرے بازی کا نام نہیں، بلکہ یہ انسان کے عمل اور کردار سے جھلکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کا اپنے وطن سے محبت کرنا فطری بھی ہے اور شرعی لحاظ سے پسندیدہ بھی۔

مکہ مکرمہ سے رسول اللہ ﷺ کی محبت: رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مکہ مکرمہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی آپ ﷺ کی جائے ولادت تھی، یہی آپ ﷺ کا وطنِ اصلی تھا، اور اسی شہر میں آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے ابتدائی اور دعوتِ نبوت کے اہم ترین سال گزارے۔

جب کفارِ مکہ کی مخالفت اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ دیا۔ لیکن مکہ سے جدائی آپ ﷺ کے دل کے لیے آسان نہ تھی۔ آپ ﷺ کے کلمات اس محبت کی واضح دلیل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَاقِفًا عَلَى الْحَزْوَرَةِ، فَقَالَ: وَاللهِ إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللهِ، وَأَحَبُّ أَرْضِ اللهِ إِلَى اللهِ، وَلَوْ لَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ۔"

ترجمہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حَزوَرَہ کے مقام پر کھڑے دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! بے شک تو اللہ کی بہترین سرزمین ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب سرزمین ہے، اور اگر مجھے تجھ سے نکالا نہ جاتا تو میں تجھ سے نہ نکلتا۔"

(جامع الترمذی، کتاب المناقب، حدیث:3925۔)

یہ حدیث حبِ وطن کے موضوع پر ایک بنیادی اور واضح دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی فضیلت بیان کرنے کے ساتھ اپنی قلبی کیفیت بھی ظاہر فرمائی کہ اگر آپ ﷺ کو مکہ سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو آپ ﷺ اسے نہ چھوڑتے۔

ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

"قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِمَكَّةَ: مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ، وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ۔"

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے فرمایا: اے مکہ! تو کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا محبوب ہے! اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی اور جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔" (جامع الترمذی، کتاب المناقب، حدیث:3926۔)

ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اپنی جائے پیدائش مکہ مکرمہ کی گہری محبت تھی۔

مدینہ منورہ: وطنِ ثانی سے محبت: ہجرت کے بعد مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ اور مہاجرینِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا نیا وطن بنا۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کو صرف رہائش کی جگہ نہیں سمجھا بلکہ اس کی خیر و برکت اور صحت و سلامتی کے لیے دعائیں فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی:

"اللَّهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، وَصَحِّحْهَا، وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا، وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ۔"

ترجمہ: اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت اسی طرح پیدا فرما جیسے ہمیں مکہ سے محبت ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اسے ہمارے لیے صحت و عافیت کی جگہ بنا دے، اس کے صاع اور مد میں ہمارے لیے برکت عطا فرما، اور اس کی بیماری کو جُحفہ کی طرف منتقل فرما۔" (صحیح البخاری، حدیث:1889؛ صحیح مسلم، حدیث:1376۔)

یہ دعا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کی محبت کو اپنے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔

مدینہ کی طرف واپسی پر خوشی: رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ سے تعلق کا ایک خوبصورت عملی مظہر سفر سے واپسی کے وقت نظر آتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ إِلَى جُدُرَاتِ الْمَدِينَةِ أَوْضَعَ رَاحِلَتَهُ، وَإِنْ كَانَتْ دَابَّةً حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر سے واپس آتے اور مدینہ کی دیواروں کو دیکھتے تو مدینہ کی محبت کی وجہ سے اپنی سواری کو تیز کر دیتے، اور اگر سواری کوئی دوسرا جانور ہوتی تو اسے بھی تیز چلاتے۔" (صحیح البخاری، کتاب العمرۃ، حدیث:1802۔)

یہ روایت حبِ وطن کی ایک فطری کیفیت کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان سفر سے واپسی پر اپنے وطن کی حدود اور آبادی دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کی خواہش کرتا ہے۔

حبِ وطن کے عملی تقاضے: سیرتِ نبوی ﷺ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ وطن سے محبت صرف جذبات اور دعووں کا نام نہیں بلکہ عملی

ذمہ داریوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک حقیقی محبِ وطن وہ ہے جو اپنے وطن کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

1۔ وطن کی سلامتی اور دفاع: وطن کی سلامتی ہر شہری کی اہم ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کی عظیم فضیلت بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُهُ، وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الْفَتَّانَ۔"

ترجمہ: 'ایک دن اور ایک رات سرحد کی نگہبانی کرنا ایک مہینے کے روزے رکھنے اور راتوں کو قیام کرنے سے بہتر ہے۔ اور اگر وہ اسی حالت میں وفات پا جائے تو اس کا وہ عمل جاری رکھا جائے گا جو وہ کیا کرتا تھا، اس کا رزق بھی جاری کیا جائے گا اور وہ آزمائش میں ڈالنے والے سے محفوظ رہے گا۔'' (صحیح مسلم ۱۹۱۳)

اگرچہ اس حدیث کا اصل تعلق اسلامی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت سے ہے، تاہم اس سے عمومی طور پر سرحدوں کی نگہبانی، جان و مال کے تحفظ اور امن وامان کی حفاظت کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ لہٰذا غیر اسلامی ملک میں قانونی طور پر اپنے ملک اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے والے شخص کے عمل کو خدمتِ خلق اور حفاظتِ عامہ کے اعتبار سے اجر کی امید کی جا سکتی ہے،

2۔ قانون کی پاسداری اور امن وامان: رسول اللہ ﷺ نے معاشرے میں عدل وانصاف اور قانون کی حکمرانی قائم فرمائی۔ اپنے وطن کے قوانین کی پاسداری کرنا، شہریوں کے حقوق کا احترام کرنا، اور ملک میں کسی بھی قسم کے انتشار، دہشت گردی یا فساد سے بچنا ایک مسلمان کا دینی اور قومی فریضہ ہے۔

خلاصہ کلام: سیرتِ طیبہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مطالعہ ہمیں یہ واضح پیغام دیتا ہے کہ اپنے وطن سے محبت انسان کے ایمان اور فطرت کا تقاضا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کی جدائی پر آنسو بہا کر اور مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنا کر اس کی سلامتی وترقی کی دعائیں مانگ کر دنیا کے سامنے حبِ وطن کا ایک اعلیٰ ترین معیار قائم فرمایا۔

آج کے دور میں، جب دنیا مختلف نظریاتی اور سیاسی بحرانوں کا شکار ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں حبِ وطن کے حقیقی مفہوم کو سمجھیں۔ اپنے ملک کی حفاظت کرنا، اس کے قوانین کی احترام کرنا واقعی حبِ وطن ہے جس کا درس ہمیں ہمارے نبی کریم ﷺ نے دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

یومِ آزادی: ماضی کی قربانیاں حال کی ذمہ داریاں اور مستقبل کے تقاضے

مولانا ابرار افضل صاحب حفظہ اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔ متعلم: جامعۃ الملک خالد، ابہا، سعودی عرب

تمہید:

تاریخِ اقوام میں بعض ایام ایسے ہوتے ہیں جو محض کیلنڈر کی تاریخ نہیں رہتے بلکہ ایک قوم کے اجتماعی شعور تہذیبی حافظے اور فکری شناخت کی علامت بن جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لیے 15 اگست بھی ایسا ہی ایک تاریخی دن ہے۔ یہ صرف اقتدار کی منتقلی یا سیاسی آزادی کی یادگار نہیں بلکہ ان بے شمار قربانیوں، صبر آزما جدوجہد اور بلند حوصلوں کی داستان ہے جنہوں نے غلامی کی طویل شب کے بعد آزادی کی صبح کو ممکن بنایا۔

آزادی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے مگر ہر نعمت کی طرح اس کا بھی ایک حق ہے اگر آزادی کو صرف جشن تقریبات اور رسمی نعروں تک محدود کر دیا جائے تو اس کی حقیقی روح پسِ منظر میں چلی جاتی ہے زندہ قومیں یومِ آزادی کو محاسبۂ نفس، تجدیدِ عہد اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا دن بناتی ہیں۔ وہ اپنے ماضی سے سبق سیکھتی ہیں حال کا جائزہ لیتی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسی بنیادیں استوار کرتی ہیں جن پر ایک مضبوط باوقار اور پرامن معاشرہ تعمیر ہو سکے

ہندوستان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ مختلف زبانوں، ثقافتوں، مذاہب اور تہذیبی روایات کا حسین امتزاج ہے اسی تنوع نے تحریکِ آزادی کو بھی قوت بخشی اس جدوجہد میں ہر طبقے اور ہر خطے کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں حصہ لیا یہ حقیقت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ وطن کی تعمیر ہمیشہ مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے کسی ایک طبقے یا ایک جماعت کی نہیں

اسلام بھی وطن میں امن، عدل اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ "بے شک اللہ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔" (سورۃ النحل:90)

یہ مختصر آیت دراصل ایک صالح معاشرے کا منشور ہے انصاف دیانت، باہمی احترام اور خیر خواہی ہی وہ ستون ہیں جن پر کسی بھی قوم کی حقیقی ترقی قائم ہوتی ہے۔

☆ آزادی کی اصل قیمت:

آزادی کبھی اتفاقاً حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے قربانیوں کی ایک طویل تاریخ ہوتی ہے ہندوستان کی آزادی بھی لاکھوں انسانوں کی جدوجہد صبر اور ایثار کا ثمر ہے اگرچہ تاریخ میں چند نمایاں شخصیات کا ذکر زیادہ ملتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے شمار گمنام افراد نے بھی اپنے خون اپنے مال اور اپنی آسائشوں کو وطن کے مستقبل پر قربان کیا۔

اس حقیقت کا تقاضا ہے کہ آزادی کو محض ایک حاصل شدہ نعمت نہ سمجھا جائے بلکہ ایک ایسی امانت تصور کیا جائے جس کی حفاظت ہر نسل کی ذمہ داری ہے جو قومیں اپنے محسنوں کی قربانیوں کو فراموش کر دیتی ہیں وہ آہستہ آہستہ اپنی قومی روح بھی کھو دیتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ" (صحیح بخاری:893،صحیح مسلم:1829)

ترجمہ:"تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال ہوگا۔"

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر صرف حکمرانوں کا فریضہ نہیں بلکہ ہر شہری اپنی جگہ اس امانت کا نگہبان ہے یہی احساسِ ذمہ داری آزادی کو دوام بخشتا ہے اور قوموں کو زوال سے محفوظ رکھتا ہے

☆ آزادی کے بعد ہماری ذمہ داریاں:

تعمیرِ وطن کا حقیقی راستہ کسی قوم کی عظمت صرف اس کی آزادی میں نہیں بلکہ اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ آزادی کے بعد اپنے اجتماعی کردار کو کس سمت لے جاتی ہے تاریخ گواہ ہے کہ وہی قومیں دیرپا ترقی حاصل کرتی ہیں جو اپنے نوجوانوں کو علم تحقیق، اخلاق اور قانون کی پاسداری کا شعور دیتی ہیں آزادی کا حقیقی جشن بھی اسی وقت معنی خیز ہوتا ہے جب وہ قومی تعمیر کی عملی تحریک بن جائے

قرآنِ مجید اہلِ ایمان کو عدل وانصاف پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾

ترجمہ:"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے بنو۔"(سورۃ المائدۃ:8)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "المسلمُ من سلِم الناسُ من لسانِه ويدِه۔"

ترجمہ:"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔" (صحیح بخاری:10۔صحیح مسلم:40)

یہ تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ ایک صالح شہری کی شناخت اس کے مذہبی دعووں سے پہلے اس کے کردار دیانت اور حسنِ اخلاق سے ہوتی ہے۔

☆ موجودہ ہندوستان اور مسلمانوں کی ذمہ داری:

آج کا ہندوستان تیز رفتار ترقی سائنسی پیش رفت اور عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے کردار کا حامل ملک ہے لیکن اس کے ساتھ سماجی ہم آہنگی تعلیمی مساوات اور باہمی اعتماد جیسے چیلنجز بھی موجود ہیں ایسے حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ نہیں کہ وہ مایوسی یا ردِّ عمل کی نفسیات کا شکار ہوں بلکہ وہ اپنے دین کی تعلیمات کے مطابق علم حکمت صبر اور مثبت کردار کو اپنا شعار بنائیں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہندوستان کا آئین تمام شہریوں کو مساوی شہریت مذہبی آزادی اور قانون کے سامنے برابری کی ضمانت دیتا ہے اسی لیے ہر ذمہ دار شہری کا فرض ہے کہ وہ آئین اور قانون کا احترام کرے اپنے حقوق سے باخبر رہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔

مسلمانوں کے لیے اس دور کی سب سے بڑی ضرورت تعلیم ہے دینی علوم کے ساتھ جدید تعلیم تحقیق، سائنس، ٹیکنالوجی، قانون، معیشت اور سماجی قیادت میں آگے بڑھنا وقت کا اہم تقاضا ہے جس قوم کے نوجوان علم میں ممتاز ہوتے ہیں وہی قوم عزت وقار اور اثر ورسوخ حاصل کرتی ہے۔

آج مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے بجائے اصلاح جذبات کے بجائے حکمت اور شکایت کے بجائے تعمیری کردار کو اختیار کریں یہی راستہ ان کے دینی تشخص کی حفاظت بھی کرے گا اور وطن کی ترقی میں بھی مثبت کردار ادا کرے گا۔

☆مستقبل کے تقاضے: (امید کردار اور تعمیرِ وطن)

ہر دور اپنی نسل سے ایک سوال کرتا ہے کہ وہ آنے والے ہندوستان کو کیسا دیکھنا چاہتی ہے؟ اس سوال کا جواب نعروں میں نہیں بلکہ تعلیم، کردار، انصاف اور خدمتِ خلق میں پوشیدہ ہے آج کا ہندوستان نوجوانوں کا ہندوستان ہے اور اس کے مستقبل کا دارومدار بھی نوجوانوں کی فکری پختگی، علمی صلاحیت اور اخلاقی کردار پر ہے

خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ وقت مایوسی یا بے عملی کا نہیں بلکہ خود احتسابی اور ازسرِ نو تعمیر کا ہے اگر ہم اپنی نئی نسل کو قرآن وسنت کی تعلیمات کے ساتھ جدید علوم، تحقیق، ٹیکنالوجی، قانون، طب، معیشت اور سماجی قیادت سے آراستہ کریں تو وہ نہ صرف اپنی ملت بلکہ پورے ملک کے لیے باعثِ خیر ثابت ہوگی

قرآنِ مجید کا یہ ابدی اصول آج بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾۔

ترجمہ: "بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے۔" (سورۃ الرعد: 11)

یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ تبدیلی کا آغاز ہمیشہ فرد سے ہوتا ہے ایک مخلص طالبِ علم، ایک دیانت دار تاجر، ایک انصاف پسند وکیل، ایک باکردار استاد اور ایک ذمہ دار شہری مل کر ایک مضبوط قوم کی بنیاد رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"خير الناس أنفعهم للناس" ترجمہ: "لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔"

(الطبرانی، المعجم الأوسط، حدیث: 5937۔ اس کے شواہد کی بنا پر بہت سے اہلِ علم نے اس کے مفہوم کو حسن قرار دیا ہے۔)

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمان کی اصل پہچان معاشرے کے لیے خیر اور فائدہ پہنچانا ہے یہی وہ پیغام ہے جو ایک مہذب پرامن اور ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

☆اختتامیہ:

یومِ آزادی ہمیں صرف ماضی کی یاد نہیں دلاتا بلکہ مستقبل کی ذمہ داری بھی یاد دلاتا ہے اگر ہمارے اسلاف نے آزادی حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دیں تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس آزادی کو علم، انصاف، دیانت، قومی یکجہتی اور اعلیٰ اخلاق کے ذریعے مضبوط کریں۔

آیئے! اس یومِ آزادی پر ہم یہ عہد کریں کہ ہم اپنے وطن سے محبت کو محض الفاظ تک محدود نہیں رکھیں گے، بلکہ اسے اپنے کردار، اپنی محنت، اپنی دیانت، اپنی علمی ترقی اور اپنی سماجی خدمت کے ذریعے ثابت کریں گے۔ یہی حقیقی حب الوطنی ہے، یہی ایک ذمہ دار شہری کی پہچان ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو ہندوستان کو ایک روشن، مضبوط اور باوقار مستقبل کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات کہنے، عدل پر قائم رہنے، علم سے وابستہ ہونے، اخلاق کو اپنانے اور اپنے وطن و معاشرے کے لیے خیر و بھلائی کا ذریعہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

مراجع و مصادر:

قرآن مجید۔

صحیح بخاری۔

صحیح مسلم۔

دستورِ ہند (Constitution of India)۔

مولانا ابوالکلام آزاد، India Wins Freedom۔

علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال۔

دعوت وتبلیغ کا انداز کیسا ہونا چاہیے؟

"علماء و مبلغین اور واعظین کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، دین اسلام سیکھنے، سکھانے اور عمل کرنے کے مواقع ان کے لیے ہمیشہ میسر رہتے ہیں، عوام الناس تک حق بات پہنچانا اگر چہ بہت بھاری ذمہ داری ہے مگر اس مشن میں اجر و ثواب بھی بے مثال ہے، لہذا ایک مبلغ کے لیے ہمیشہ دین کی تبلیغ کو موثر بنانے کے لیے دعوت و تبلیغ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا فرض ہے، مثلاً پہلے دین کا علم خود حاصل کرنا، پھر اس پر عمل کرنا، پھر ہر ممکن طریقے سے اس کی تبلیغ کرنا، پھر اس پر جو مصائب آئیں ان پر صبر کرنا وغیرہ۔"

مزید یہ کہ تبلیغ کا انداز حکیمانہ ہو، اخلاق کریمانہ ہوں، لوگوں کی عقل و فہم کے مطابق بات کی جائے (گاڑھی اردو اور عربی زدہ زبان سے احتراز کیا جائے)، بے جا کفر کے فتووں سے پرہیز کیا جائے اور تبلیغ کا آغاز (پہلے اپنی ذات سے) اپنے گھر، پھر قوم اور پھر علاقہ سے کیا جائے وغیرہ۔

(اقتباس از: سیرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے تقاضے، ابوسعد آصف عباس حماد، ص: ۲۰۸)

عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت

شیخ اشرف شاکر ریاضی حفظہ اللہ ——— استاذ کلیہ ابو بکر صدیق، گمانی

محترم قارئین کرام! دور حاضر میں عالمی پیمانے پر ۱۲/ربیع الاول کو مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا "جشن عید میلاد" مناتا ہے بلکہ آج کل اُسے اہل سنت کا خاص شعار سمجھا جانے لگا ہے، شرعی حیثیت سے یہ باطل ومردود ونا جائز عمل ہے اور اسلام میں یہ بدعت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دیگر قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے عید کے دو دن مقرّر کیے ہیں: (۱) عید الفطر اور (۲) عید الاضحیٰ، یہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جب کہ آپ نے اہلِ مدینہ کو دوسرے دنوں میں زمانۂ جاہلیت کے طرز پر عید وخوشی مناتے دیکھا۔ (ابوداود: ۱۱۳۴، نسائی: ۱۵۵۷)

اس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کے لیے سالانہ صرف دو دنوں کو عید کے طور پر مقرر فرمایا، ان کے علاوہ بعض روایتوں میں جمعہ کے دن کو بھی عید کہا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی دن کے متعلق عید کا لفظ وارد نہیں ہوا۔ اب اگر کوئی اس پر زیادتی کر کے اپنی طرف سے مزید ایک دن بڑھاتا اور اس میں عید جیسی خوشیاں مناتا ہے، تو وہ گویا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ عالی پر عدم رضامندی کا اظہار کرتا ہے، اور جو اسے دین کا حصہ سمجھتا ہے، وہ اپنی طرف سے نیا دین تراشتا ہے اور یہ دونوں ہی طریقہ عمل نہایت خطرناک ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار بجا ہے اور آپ ﷺ کی عقیدت واحترام کا جذبہ بھی قابل تحسین ہے... مگر دیکھنا یہ ہے کہ آپ ﷺ سے محبت کا یہ طریقہ اور جشن وجلوس کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی رو سے جائز بھی ہے یا نہیں...؟ شریعت کی عدالت میں اس کی کوئی حیثیت بھی ہے یا نہیں؟ اور اللہ کی بارگاہ میں یہ قابل قبول بھی ہے یا نہیں...؟!

☆ نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم سے محبت کا معنی:

اس سلسلے میں کوئی شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی محبت کرنا جزو ایمان ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔

عن أنس بن مالكٍ رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحبَّ إليه من ولده ووالده والناس أجمعين۔"

ترجمہ: "تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک ایماندار نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے والد اور اولاد سے بھی زیادہ اس کا محبوب نہ بن جاؤں۔" (بخاری: کتاب الایمان: باب حب رسول من الایمان؛ ۱۴)

لیکن اس محبت کا معیار اور تقاضا کیا ہے؟ کیا محض زبان سے محبت کا دعویٰ کر دینا ہی کافی ہے یا اس کے لئے کوئی عملی ثبوت بھی مہیا کرنا ہوگا؟ صاف ظاہر ہے کہ محض زبانی دعویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے ساتھ عملی ثبوت بھی ضروری ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے جسم وجان پر اللہ کے رسول ﷺ کے ارشادات وفرمودات کی حاکمیت ہو، اس کا ہر کام شریعت نبوی کے مطابق

ہو، اس کا ہر قول حدیثِ نبوی کی روشنی میں صادر ہوتا ہو۔ اس کی ساری زندگی اللہ کے رسول کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق مرتب ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری ہی کو وہ معیارِ نجات سمجھتا ہو اور آپ ﷺ کی نافرمانی کو موجبِ عذاب خیال کرتا ہو۔ لیکن اگر اس کے برعکس کوئی شخص ہر آن اللہ کے رسول ﷺ کی حکم عدولی کرتا ہو اور آپ کی سنت و ہدایت کے مقابلہ میں بدعات ورسومات کو ترجیح دیتا ہو تو ایسا شخص حبِ رسول کا لاکھ دعویٰ کرے یہ کبھی اپنے دعویٰ میں سچا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اپنے تئیں سچا سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے مگر اللہ کے رسول ایسے نافرمان اور سنت کے تارک سے بری ہیں کیونکہ آپ ﷺ کا ارشادگرامی ہے:

''فمن رغب عن سنتي فليس مني'' (بخاری، ۵۰۶۳)

ترجمہ: "جس نے میری سنت سے روگردانی کی، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت:

محترم قارئین کرام: ۱۲؍ربیع الاول کے یوم ولادت ہونے پر مؤرخین کا ہرگز اتفاق نہیں۔ البتہ اس بات پر تقریباً تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ۱۲؍ربیع الاول کو حضور ﷺ کی وفات ہوئی، البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ حضور ﷺ کی تاریخ ولادت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ عام الفیل (یعنی جس سال ابرہہ نے ہاتھیوں کے لشکر سے بیت اللہ شریف پر حملہ کیا) میں پیدا ہوئے۔ نیز فرماتے ہیں کہ اس میں بھی اختلاف نہیں کہ آپ ﷺ سوموار کے روز پیدا ہوئے۔ نیز لکھتے ہیں کہ جمہور اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ ماہ ربیع الاول میں پیدا ہوئے لیکن یہ کہ آپ ﷺ اس ماہ کے اول، آخر یا درمیان یا کس تاریخ کو پیدا ہوئے؟ اس میں مؤرخین اور سیرت نگاروں کے متعدد اقوال ہیں کسی نے ربیع الاول کی دو تاریخ کہا، کسی نے آٹھ، کسی نے دس، کسی نے بارہ، کسی نے سترہ، کسی نے اٹھارہ اور کسی نے بائیس ربیع الاول کہا۔ پھر حافظ ابن کثیر نے ان اقوال میں سے دو کو راجح قرار دیا، ایک بارہ اور دوسرا آٹھ اور پھر خود ان دو میں سے آٹھ ربیع الاول کے یوم ولادت ہونے کو راجح قرار دیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ: ص ۲۵۹ تا ۲۶۲؍ج ۲)

☆ بدعتِ عید میلاد کا موجِد کون؟:

عید میلاد کا جشن سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں رافضی و غالی شیعہ جنہیں فاطمی بھی کہا جاتا ہے، نے حبِ نبوی اور حبِ اہل بیت کی آڑ میں اس وقت جاری کیا جب انہیں مصر میں باقاعدہ حکومت و اقتدار مل گیا۔ ان لوگوں نے نہ صرف "میلاد النبی ﷺ" کا تہوار جاری کیا بلکہ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسن وحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے "میلاد" بھی سرکاری سطح پر جاری کئے۔ حافظ ابن کثیرؒ ان رافضیوں کے عقائد ونظریات کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

"یہ کافر و فاسق، فاجر وملحد، زندیق و بے دین، اسلام کے منکر اور مجوسیت وثنویت کے معتقد تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کیا، زنا کو جائز، شراب اور خون ریزی کو حلال قرار دیا۔ یہ دیگر انبیا کو گالیاں دیتے اور سلف صالحین پر لعن طعن کرتے تھے۔"

نیز لکھتے ہیں کہ "فاطمی خلفاء بڑے مالدار، عیاش اور جابر و سرکش تھے۔ ان کے ظاہر و باطن میں نجاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے دورِ حکومت میں منکرات و بدعات ظہور پذیر ہوئیں... سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۶۴ ہجری میں مصر پر

چڑھائی کی اور ۵۶۸ ہجری تک ان کا نام ونشان مٹادیا۔“ (البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/ ۲۵۵ تا ۲۷۱)

☆ بدعتِ میلاد النبی کی ارتقاء:

بدعتِ میلاد جب شیعوں سے سنّیوں اور سنّیوں کے بھی بادشاہوں میں رائج ہوگئی تو اب ان بادشاہوں کے خلاف آوازِ حق بلند کرنا یا دوسرے لفظوں میں ان کے بدعات وخرافات پر مذمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض خودغرض مولویوں نے بادشاہِ وقت کی ان تمام خرافات کو عین شریعت اور کارِ ثواب قرار دے دیا۔ چنانچہ عمر بن حسن المعروف ابن دحیہ اندلسی نامی ایک مولوی نے "التنویر في مولد البشیر والنذیر" نامی کتاب لکھی جس میں قرآن وسنت کے نصوص کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اور انہیں تاویلاتِ باطلہ کا لبادہ اوڑھا کر عیدِ میلاد کو شرعی امر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی اور بادشاہِ وقت سے ہزار دینار انعام حاصل کیا۔ (ملاحظہ ہو البدایۃ والنھایۃ: ۱۳/ ۱۲۴ / وفیات الاعیان: ۴/ ۱۱۹ / الحاوی للفتاوی: ۱/ ۱۸۹)

واضح رہے کہ اس ابن دحیہ اندلسی کو محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتماد راوی قرار دیا ہے مثلاً امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ متہم (جس پر جھوٹ کا الزام ہو) راوی ہے۔ (میزان الاعتدال: ۳/ ۱۸۶) اسی طرح حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ”یہ ظاہری مذہب کا حامل تھا۔ ائمہ کرام اور سلف صالحین کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ خبیث اللسان، احمق، شدید متکبر، دینی اُمور میں کم علم اور بے عمل شخص تھا۔“ (لسان المیزان: ص ۲۹۶/ ج ۴)

☆ عید میلاد النبی علما کرام کی نظر میں:

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ:

آپ سے سوال کیا گیا کہ ۱۲/ ربیع الاوّل کو عید میلاد النبی منانا جائز ہے؟ تو آپ نے اس کا یہ جواب دیا کہ:

”عید میلاد النبی منانا اور جشن وجلوس کا اہتمام کرنا بدعت ہے اور سنت کے مخالف ہے اور سنت کی مخالفت حرام ہے لہٰذا یہ بالکل جائز نہیں۔“ (فتاویٰ عزیزیہ: ص ۹۳)

۲: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

”سلف صالحین نے محفل میلاد کا انعقاد نہیں کیا حالانکہ اس وقت اس کا تقاضا تھا اور اس کے انعقاد میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ اگر یہ محض خیر وبھلائی ہی کا کام ہوتا یا اس میں خیر کا پہلو راجح ہوتا تو سلف صالحین اسے حاصل کرنے کے لئے ہم سے زیادہ حقدار تھے۔ وہ ہماری نسبت اللہ کے رسول ﷺ سے بہت زیادہ محبت اور تعظیم وتکریم کرنے والے اور نیکی کے کاموں میں ہم سے زیادہ رغبت کرنے والے تھے۔ آپ ﷺ سے محبت وتکریم کا معیار یہ ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے، آپ ﷺ کی سنت کو ظاہری اور باطنی طور پر زندہ کیا جائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو آگے پھیلایا جائے اور اس مقصد کے لئے دل، ہاتھ اور زبان سے جہاد کیا جائے۔ مہاجرین وانصار جیسے ایمان میں سبقت کرنے والوں اور ان کی اچھے طریقے کے ساتھ پیروی کرنے والوں کا یہی طریقہ تھا۔“ (اقتضاء الصراط المستقیم: ص ۲۹۵)

۳۔ ابن الحاج: ابوعبداللہ محمد بن محمد العبدالمعروف بابن الحاج رقم طراز ہیں:

"لوگوں کی جاری کردہ بدعات میں سے ایک بدعت ربیع الاول میں محفل میلاد کا قیام ہے۔اس بدعت کو اختیار کرنے والے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ایک سب سے بڑی عبادت اور شعائرِ اسلامیہ کے اظہار کا عمل ہے۔ حالانکہ یہی بدعت میلاد مزید کئی بدعات و محرمات پر بھی مشتمل ہے۔"

نیز فرماتے ہیں کہ: "محفل میلاد کے موقع پر اگر سماع وغنا کا بھی انتظام ہوتو یہ ظلمات بعضھا فوق بعض کی طرح ہے۔ اور اگر محفل میلاد سماع وغنا اور دیگر مفاسد سے مبرا ہو اور صرف لوگوں کے لئے میلاد کی نیت سے کھانے کا انتظام ہوتو تب بھی یہ بدعت ہے کیونکہ یہ دین میں اضافہ ہے۔ سلف صالحین کے ہاں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنا ہی زیادہ بہتر ہے۔" (المدخل: ج ۲ ص ۲۲۹)

۵۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ:

مسلمانو کے لیے ۱۲ / ربیع الاول کی رات یا کسی اور رات میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل منعقد کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کی ولادت کی محفل منعقد کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ میلاد کی محفلوں کا تعلق ان بدعات سے ہے، جو دین میں نئی پیدا کر لی گئی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ پاک میں کبھی اپنی محفلِ میلاد کا انعقاد نہیں فرمایا تھا؛ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے تمام احکام کو بلا کم و کاست، من وعن پہنچانے والے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مسائلِ شریعت کو بیان فرمانے والے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محفلِ میلاد نہ خود منائی اور نہ کسی کو اس کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاءِ راشدین، حضراتِ صحابہ کرام اور تابعین میں سے کسی نے کبھی اس کا اہتمام نہیں کیا تھا، الخ۔ (مقالات وفتاویٰ: ۴۰۶ اردو)

۵۔ تاج الدین الفاکہانیؒ: شیخ تاج الدین عمر بن علی الفاکہانیؒ رقم طراز ہیں کہ:

"بہت سے لوگوں نے بار بار مجھ سے عید میلاد النبی ﷺ کے بارے میں پوچھا کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا یہ دین میں ایک بدعت ہے؟ تو میں نے کہا کہ کتاب وسنت سے اس میلاد کی کوئی دلیل مجھے نہیں ملی اور علمائے اُمت جو دین میں ایک نمونہ اور سلف کے آثار پر گامزن رہنے والے تھے، ان میں سے بھی کسی سے اس کی مشروعیت منقول نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بدعت ہے جسے باطل پرستوں، خواہش نفس کے پجاریوں اور پیٹ پرستوں نے گھڑا ہے۔" (الحاوی للفتاوی: ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۱)

☆ **حاصل کلام:**

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عید میلاد النبی شرعی طور پر غیر ثابت شدہ عمل ہے بلکہ یہ دین میں بدعت ہے کیونکہ نہ تو اس کا اہتمام دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا ہے اور نہ ہی خیر القرون میں ہوا ہے، لہٰذا ملت اسلامیہ کو اس سے دوری اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

"اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ"

☆☆☆☆☆

ربیع الاول میں رائج بدعات وخرافات کا تحقیقی جائزہ

ابوعمر حافظ محمد فاروق سلفی

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے پیارے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور بتدریج احکام ومسائل نازل فرمایا۔ پیارے رسول ﷺ نے نبوت ورسالت ملنے کے بعد اپنی پوری زندگی اسی کی دعوت وتبلیغ کی۔ اور وفات سے قبل دین کا کوئی ایک بھی ایسا مسئلہ نہیں چھوڑا جس کی وضاحت آپ نے نہ کی ہو، بالآخر اللہ تعالیٰ نے "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" نازل فرما کر اپنے اس دین کو مکمل قرار دیا۔

اب اس دین میں حذف واضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اگر کوئی حذف واضافہ کا عقیدہ رکھتا ہے، یا عمل کرتا ہے تو وہ "مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ" کے تحت مردوں اور بدعتی قرار پائے گا۔

محترم قارئین کرام!

ربیع الاول اسلامی کیلنڈر کا تیسرا مہینہ ہے، کتاب وسنت میں اس مہینے میں کیا جانے والا کوئی خاص عمل ثابت نہیں ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس! کہ خود کو سنی کہنے والے کچھ مسلمان اس مہینے میں بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کی لائنیں لگا دیتے ہیں، خصوصاً اس مہینے کی بارہویں تاریخ کو اور اگر کوئی مسلمان ان خرافات سے بچتا ہے، لوگوں کو بچنے کی تلقین کرتا ہے تو اسے ابلیس اور گستاخ رسول کے لقب سے ملقب کر دیا جاتا ہے۔

ذیل میں اس مہینے میں رائج بدعات وخرافات کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ جشن عید میلاد النبی:

مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ عالمی پیمانے پر بارہ ربیع الاول کو پیارے نبی جناب محمد ﷺ کی ولادت کا دن مناتے ہیں، جسے وہ "جشن عید میلاد النبی" کا نام دیتے ہیں۔

قرآن مجید کی کچھ آیتوں کی بے جا تاویل اور احادیث سے زبردستی استنباط کر کے دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔

نبوت ملنے کے بعد پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم 23 سال تک زندہ رہے کیا آپ نے کبھی اس کی تعلیم دی؟

سن 10 ہجری میں پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سن 40 ہجری تک خلفائے راشدین کا زمانہ رہا کیا کسی نے بھی اس دن میلاد بنایا؟

سب سے آخری صحابی ابوطفیل عامر بن واصلہ اللیثی ہیں، جن کی وفات سن 110 ہجری میں ہوئی۔

کیا یہاں تک کسی ایک بھی صحابی سے اس دن میلاد بنانا ثابت ہے؟

صحابہ کرام کی وفات کے بعد تابعین میں سے سب سے آخری تابعی خلف بن خلیفہ الکوفی جن کی وفات سن 170، 180 یا 181 ہجری میں ہوئی۔

یہاں تک کیا کسی ایک تابعی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن منایا؟
تابعین کی وفات کے بعد تبع تابعین کا زمانہ آتا ہے، سب سے اخری تبع تابعی جن کی وفات سن 220 ہجری میں ہوئی۔
کیا ان میں سے کسی ایک تبع تابعی نے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد منایا؟ (ماخوذ از: تحفۃ المسلم شرح صحیح مسلم)
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ 80ھ میں پیدا ہوئے، 150ھ میں وفات ہوئے۔
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ 93ھ میں پیدا ہوئے، 179ھ میں وفات ہوئے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ 150ھ میں پیدا ہوئے، 204ھ میں وفات ہوئے۔
امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ 164ھ میں پیدا ہوئے، 241ھ میں وفات ہوئے۔
یہ چار ائمہ کرام ہیں کیا ان میں سے کسی ایک نے بھی پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن منایا یا منانے کا حکم دیا؟
یہاں تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن منانے کا کوئی ایک بھی ثبوت نہیں ملتا ہے!
تو پھر یہ خود کو سنی کہنے والے نام نہاد مسلمان کس دلیل کی بناء پر "جشن عید میلاد النبی" مناتے ہیں؟
یا کیا یہ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ دین مکمل نہیں بتایا ہم لوگوں کو!
یا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کیا، لکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہنستے تھے، ایسا چلتے تھے، ایسا مسکراتے تھے۔۔۔۔
چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جنہوں نے نوٹ کیا ان سے ایک اہم اور بڑا عمل چھوٹ گیا؟
کیا صحابہ کرام سے زیادہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں؟

☆ عید میلاد النبی ﷺ کی تاریخی حیثیت:

عید میلاد النبی ﷺ کا جشن سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں فاطمی حکومت کے زیرِ اثر رائج ہوا، جو غالی شیعہ و رافضی نظریات کی حامل تھی۔ مصر میں جب فاطمیوں کو با قاعدہ اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے محبتِ رسول ﷺ اور محبتِ اہلِ بیت کے نام پر مختلف میلادوں کی تقریبات سرکاری سطح پر شروع کیں۔

ان میں صرف میلاد النبی ﷺ ہی نہیں، بلکہ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے میلاد بھی شامل تھے۔ یوں میلاد کی یہ تقریبات ایک دینی شعار کی حیثیت سے نہیں بلکہ فاطمی دورِ حکومت میں ایک سرکاری رسم کے طور پر ظاہر ہوئیں۔

☆ نبی ﷺ کی ولادت کی تاریخ:

پیارے رسول صلی اللہ عیہ وسلم کی ولادت کا دن یہ جو لوگ مناتے ہیں ان سے میں ذرا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمام مورخین کے نزدیک پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن 12 ربیع الاول ہے، اس میں تقریباً سارے مؤرخین متفق ہیں، کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

لیکن ولادت کے دن میں بہت اختلاف ہے، بعض نے 9، بعض نے 8، بعض نے 12، بعض نے 17 اور بہت سارے اقوال بیان کیے ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ راجح قول 9 ہے۔

تو ذرا میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ ولادت کا دن مناتے ہیں یا وفات کا دن، یہ فیصلہ وہ لوگ خود کریں؟

☆ بارہ ربیع الاول کو خصوصی دن (تہوار اور عید کا دن) سمجھنا:

اللہ رب العالمین نے ہم مسلمانوں کے لیے دو بڑے خوشی کے دن رکھے ہیں، جسے ہم عیدین کے نام سے جانتے ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ اس سال عید الفطر کی نماز 28 رمضان کو ہوگی یا 2 شوال کو ہوگی، یا عید الاضحیٰ کے بارے میں جو 10 ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا ہے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن منانا یہ عید میں شامل ہوتا تو اللہ رب العالمین اس دن میں اختلاف نہیں رکھتا جس طرح پورے دین کو اللہ رب العالمین نے واضح کر دیا اسی طرح اگر یہ بھی عید کا دن ہوتا تو اسے بھی واضح کر دیتا

لہذا ثابت ہوا کہ یہ کوئی عید کا دن نہیں ہے کیونکہ اگر ہوتا تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا یا تو پھر اس کی واضح دلیل موجود ہوتی۔

گھروں، دکانوں، مسجدوں اور گلیوں کو چراغوں، جھنڈوں اور قمقموں سے سجانا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا عقیدہ رکھنا۔

ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی کچھ مسلمان اپنے گھروں مسجدوں اور گلیوں سڑکوں کو پھولوں سے، قمقموں سے، جھنڈوں سے، خوب سجاتے ہیں۔ اور خوب اسراف وتصریف سے کام لیتے ہیں، جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور 12 ربیع الاول کو ان کا خصوصی عقیدہ ہوتا ہے کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں جو کہ ایک شرکیہ عقیدہ ہے کیونکہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔

میلاد النبی کے نام پر مخصوص محفلین قائم کرنا اور ان میں غیر ثابت شدہ، موضوع روایات کو سیرت النبی کے حوالے سے بیان کرنا اور ایسی نعتیں پڑھنا جن میں پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے غلو سے کام لیا گیا ہو۔

ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی یہ عمل بھی خوب زور وشور سے چل رہا ہوتا ہے کہ لوگ محفلیں منعقد کرتے ہیں اور ان محفلوں میں موضوع من گھڑت اور بے سند روایات اور فضائل والی حدیثیں بیان کرتے ہیں لوگوں کو کہانیاں سنا رہے ہوتے ہیں اور ایسے نعتیں بھی پڑھی جاتی ہیں جن میں پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں غلو سے کام لیا جاتا ہے۔

جب کہ یہ بات واضح ہے کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف ایسی باتیں منسوب کی جن کا تعلق مجھ سے نہیں ہے یا میں نے نہیں فرمایا ہے تو ایسا شخص اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

12 ربیع الاول کو جلوس نکالنا اور ان جلوس میں مرد وزن کا اختلاط کا پایا جانا بے پردگی کا عام ہونا راستوں میں جمع ہو کر لوگوں کو تکلیف دینا، رقص وموسیقی میں مست ہونا۔

12 ربیع الاول کو خوب دھوم دھام سے یہ لوگ جلوس نکالتے ہیں اور ان جلوسوں میں مرد وزن کا اختلاط پایا جاتا ہے بے پردگی عام ہوتی ہے غلو والی نعتیں پڑھی جاتی ہیں سڑکوں کو جام کیا جاتا ہے اور انے جانے والوں کو تکلیف دیا جاتا ہے اور ڈی جے میں ایسے

گانے اور میوزک بجائے جاتے ہیں جو بالکل حرام ہے اب ایک عقل سلیم رکھنے والا مسلمان ذرا سوچیں کہ کیا جو اسلام اتنا امن و شانتی والا مذہب ہے وہ ان چیزوں کی اجازت دے گا؟

☆ خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ربیع الاول کے مہینے میں جو بھی عمل انجام دیے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے بے دلیل ہیں سب بدعت پر مشتمل ہے اور ان کی کوئی ایک بھی دلیل کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے لہذا ہر مسلمان کو ان بدعت وخرافات سے بچنا چاہیے کیونکہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل دین مکمل ہو چکا ہے اور اب اس میں بدعت یا بدعت حسنہ کے نام سے کوئی عمل ایجاد کرنا اور یہ کہنا کہ یہ اچھا کام ہے یہ سراسر بدعت ہے۔

☆☆☆☆☆

حمد باری تعالیٰ

ادراک سے پرے ہے یارب مقام تیرا
ہر سمت ضوفشاں ہے روشن نظام تیرا

چڑیاں چہک چہک کر گاتی ہیں حمد تیری
چشمے سنا رہے ہیں دلکش پیام تیرا

ہر پھول کی مہک میں تیرے کرم کی خوشبو
باد صبا کے لب پر پیارا ہے نام تیرا

خورشید و ماہ وانجم جلوہ نما ہیں تیرے
راحت فزا ہے کتنا انعام عام تیرا

یا رب بنے نہ کیوں ہم توحید کے فدائی
نظمِ جہاں میں یکساں ہے انتظام تیرا

ہو شام لعل افشاں یا صبح روح افزاں
ہر رنگ میں عیاں ہے دلکش نظام تیرا

اپنی رضا سے یارب توفیضیاب کردے
سالک ہے یا الٰہی ادنیٰ غلام تیرا

☆☆☆ کلام: سالک بستوی

نعت نبی ﷺ

نعت کس کی گنگنائیں آپ کے ہوتے ہوئے
لو بھلا کس سے لگائیں آپ کے ہوتے ہوئے

اس محبت کے صلے میں آبِ کوثر چاہیے
تشنگی سے مر نہ جائیں آپ کے ہوتے ہوئے

چار سو ہے نفسی نفسی کی صداؤں کا ہجوم
ہم کسے شافع بنائیں آپ کے ہوتے ہوئے

دل فدا ہے آپ پر آقا مرے مولیٰ مرے
نقدِ جاں کس کو چکائیں آپ کے ہوتے ہوئے

آپ سے سچی محبت ہی تو ہے وجہِ نجات
کیوں کسی سے دل مِلائیں آپ کے ہوتے ہوئے

آپ کی مسجد میں جا کر ہم جھکائیں گے جبیں
کیوں کسی دَر اور جائیں آپ کے ہوتے ہوئے

دولتِ دیدار سے محروم دل کی ہے پکار
دن پرانے لوٹ آئیں آپ کے ہوتے ہوئے

اس قدر فتنوں کی زد میں ہیں مسلماں آج کل
یہ کسی کے ہو نہ جائیں آپ کے ہوتے ہوئے

آرزو کاشف کی ہے محفل سجی ہو خلد میں
اور ہم نعتیں سنائیں آپ کے ہوتے ہوئے

☆☆☆☆☆

شاعر: کاشف شکیل